خمارِ گندم

طنز و مزاح

ابنِ انشا

ساقی بک ڈپو
اردو بازار، دہلی 110006-

قیمت ـــــ ۱۲ روپے ۵۰ پیسے

بار اوّل ـــــ ۱۹۸۱ء

طابع - بیدی آفسٹ پرنٹرز - نئی دہلی ۲

ناشر:

ساقی بک ڈپو

اردو بازار، دہلی-110006.

KHUMAR-E-GANDUM IBNEINSHA Rs.12/50

ترتیب

نمبر شمار		صفحہ
۱۔	استاد مرحوم	۷
۲۔	فیض اور میں	۲۱
۳۔	جنتری نئے سال کی	۲۷
۴۔	نجات کا طالب غالبؔ	۳۳
۵۔	ناول مینوفیکچرنگ کمپنی	۴۱
۶۔	مکمل باورچی خانہ جدید	۴۶
۷۔	ہماری کمرشل سروس	۵۰
۸۔	چند غیر ضروری اعلانات	۵۴
۹۔	اشتہارات "ضرورت نہیں ہے" کے	۵۷

نمبر شمار		صفحہ
۱۰۔	ہم مہمانِ خصوصی بنے	۶۱
۱۱۔	ہم پھر مہمانِ خصوصی بنے	۶۸
۱۲۔	آپ سے ملیے	۷۲
۱۳۔	ذرا فون کر لوں؟	۷۸
۱۴۔	کچھ اور ٹکٹ کچھ اور امیدوار	۸۳
۱۵۔	آج کچھ فلموں کے بارے میں	۸۸
۱۶۔	رُباعی سے رکابی تک	۹۵
۱۷۔	شاہی میرے کا فقیری سُرمہ	۹۹
۱۸۔	ذکر حضرت مریض الملّت کا	۱۰۵
۱۹۔	فلم مائی کا لال سنسر ہوتی ہے	۱۱۰
۲۰۔	اخبار کل اور آج کے	۱۱۵
۲۱۔	ہم نے افسانہ نگاری کیوں ترک کی	۱۲۱
۲۲۔	ٹھٹم کا مشاعرہ	۱۲۵
۲۳۔	خطبۂ صدارت حضرت ابنِ انشا	۱۳۳
۲۴۔	یہ پاگل پاگل پاگل فلمی دنیا	۱۴۰
۲۵۔	فلم دیکھیے اور ثواب دارین حاصل کیجیے	۱۴۵
۲۶۔	روپیہ کمانا	۱۵۰
۲۷۔	صدارت	۱۵۴

خوشۂ اوّل

یہ مضمون اور خاکے انشاجی نے اس زمانے میں لکھے تھے جب پاکستانی قوم اپنی ساکھ بحال کرنے میں مشغول تھی۔ اُن دنوں ہم لوگ ہنسنے ہنسانے کے موڈ میں نہیں تھے۔ خوش رہنے یا خوش رکھنے کو شریفوں کا فعل نہ سمجھتے تھے اور اب جب کہ یہ مضمون کتابی صورت میں آپ کے سامنے ہیں پاکستانی قوم پہلے سے زیادہ سخت اور کڑی ہو گئی ہے اور اپنے آپ پر ہنسنے یا دوسروں کی حماقتوں سے لطف اندوز ہونے کے بجائے اپنی بیشتر توجہ "احتساب عام" پر صرف کرنے میں مصروف ہے آدمی جب اس طرح کے تشنج میں مبتلا ہوتا ہے تو معالج عام طور پر اسے تن بہ تقدیر چھوڑ دیا کرتے ہیں۔ لیکن انشاجی اپنے عہد کے وہ واحد "مجمع گیر" ہیں جنہوں نے اپنی ذاتی قرابادین سے خود پر ہنسنے کے نئے نئے نسخے دریافت کر کے بڑے بڑے جبڑا بند لوگوں کو زندہ رہنے پر مجبور کر دیا ہے اپنے آپ پر ہنسنے کے لئے بڑے وقار اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے جو شخص اصل کا خاص شریف ہو اور شرافت محض اس کا پہناوا نہ ہو، وہی ایسی ہنسی کا کھیل کھیل سکتا ہے۔ اوروں پر ہنسنا، دوسروں کا خاکہ اڑانا اور طنز کی تیغ سے کشتوں کے پشتے لگانا بڑا آسان کام ہے۔ ہر متکبر اسی طرح سے کیا کرتا ہے لیکن یہ مزاح نگار کا کام نہیں۔ مزاح نگار تو انشاجی ایسا ہوتا ہے کہ جس کے ریشے میں تکبر نام کی کوئی چیز موجود ہی نہ ہو۔ نہ اصل زندگی میں نہ تحریر کے وجود میں۔

ان ہنستے بولتے مضامین میں آپ کو بس ایک ہی دست تسلی کی تھپکی ملے گی کہ انسان کبھی بھی انسانی حدود سے تجاوز نہیں کر سکتا اور ہر حالت میں انسان کی حد تک ہی رہتا ہے اس کی بڑائی عظمت اور سربلندی کے دعوے فقط اپنے آپ کو خوش کرنے اور تشفی دینے کے لئے ہوتے ہیں ورنہ حقیقت میں ہوتا انسان ہی ہے اور یہ جو اس کی کبھی کبھار کی ڈینگ ہے تو محض خمارِ گندم کی وجہ سے ہے اور جو کہیں یہ خمار نہ ہو تو خود بھی بڑے آرام میں رہے اور دوسروں کو بھی آرام سے رہنے دے۔

انشاجی کا اپنا ایک فلسفہ تھا کہ زندگی اور زندگی کے مسائل کا کوئی نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے کیونکہ نتیجہ کچھ نکلتا ہی نہیں۔ حاصل کچھ ہوتا ہی نہیں ان کا خیال تھا کہ حاصل تو صرف حساب کے سوالوں کا ہوتا ہے اور زندگی نہ حساب ہے نہ سوال!

جن دنوں یہ مضمون رسالوں میں چھپا کرتے تھے ہم انشاجی کو منع کرتے تھے کہ ایسے عام فہم، سادہ اور "دل خوش کن" مضمون نہ لکھا کریں۔ ایسے مضمونوں کی اشاعت سے ہم سب دوستوں کے تبحر علمی کی ہیٹی ہوتی تھی اور لوگ ہمیں بھی عام فہم قسم کے ادیب سمجھنے لگے تھے۔ ہمارے بار بار زور دینے پر کہ آخر ہم کو بھی زندہ رہنا ہے اور تاریخ ادب کے ایوان میں اپنے لئے مناسب گوشہ فراہم کرنا ہے، انشاجی نے اُوپرے دل سے ہماری بات مان لی تھی۔ لیکن وعدہ کرنے کے باوجود انہوں نے ہماری اس درخواست پر کبھی سنجیدگی کے ساتھ عمل نہ کیا۔ ایسے ہی لکھتے رہے اور اس طرح لکھتے لکھتے چلے گئے۔

اشفاق احمد

اُستاد مرحوم

الہ دین نام تھا اور چراغ تخلص۔ وطن مالوف ریواڑی جو گڑگاؤں کے مردم خیز ضلع میں اہل کمال کی ایک بستی ہے اور آم کے اچار کے لئے مشہور۔ وہاں دھنیوں کے محلے میں ان کی خاندانی حویلی کے آثار اب تک موجود ہیں۔ پگڑ دادا ان کے اپنے فن کے خاتم تھے۔ شاہ غازی اورنگ زیب عالمگیر نے شہرہ سنا تو خلعت و پارچہ دے کر دلّی بلوایا اور اپنی محلسرا کے لحاف بھرنے پر مامور کیا۔ اللہ دیا نام تھا۔ لیکن ندآف الملک کے خطاب سے مشہور تھے۔ دلّی میں یہ بارہ برس رہے۔

وجاہت خاندانی کے ساتھ دولتِ روحانی بھی استاد مرحوم کو ورثے میں ملی تھی۔ ننھیال کی طرف سے سولھویں پشت میں ان کا سلسلۂ نسب نوگزے پیر سے جا ملتا ہے، جن کا مزارِ اقدس پاکستان اور ہندوستان کے قریب قریب ہر بڑے شہر میں موجود ہے۔ اور زیارت گہِ خاص و عام ہے۔ انہی دونوں نسبتوں کا ذکر کر کے کبھی کبھی کہا کرتے کہ شاعری میرے لئے ذریعۂ عزت نہیں۔ اپنے نام کے ساتھ ننگِ اسلاف ضرور لکھا کرتے۔ دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی انہیں یہی لکھنا شروع کر دیا۔

اُستاد مرحوم کہ پورا نام ان کا حضرت شاہ الہ دین چراغ چشتی نظامی ریواڑوی تھا۔ یہیں ہائی اسکول میں اردو اور فارسی پڑھاتے تھے۔ وطن کی نسبت سے اردو زبان کے

گھر کی لونڈی تھی ہی، فارسی میں کمال کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ پچیس پشت پہلے ان کے مورثِ اعلیٰ خراسان سے آئے تھے۔ کیوں آئے تھے؟ یہ سوال راقم کے دل میں بھی اکثر اٹھتا تھا۔ آخر ایک روز موقع دیکھ کر پوچھ لیا اور احتیاطاً وضاحت کر دی کہ مقصد اعتراض نہیں دریافتِ معلومات ہے۔ فرمایا۔ بابر کیوں آیا تھا؟ احمد شاہ ابدالی کیوں آیا تھا؟ اب جو راقم نے اس سوال نما جواب کی بلاغت پر غور کیا تو اپنی کم فہمی پر بےحد شرمندگی ہوئی۔ بابر نہ آتا تو ابراہیم لودھی کس سے شکست کھاتا؟ خاندانِ مغلیہ کہاں سے آتا؟ اتنی صدیاں ہندوستان کی رعایا بادشاہوں کے بغیر کیا کرتی؟ مالیہ اور خراج کس کو دیتی؟ کچھ ایسی ہی حکمت استاد مرحوم کے مورثِ اعلیٰ کے ہندوستان آنے میں ضرور ہوگی، جس تک معمولی ذہن کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ خیر یہ ذکر تو ضمناً آ گیا۔ مقصودِ کلام یہ کہ خراسان کی نسبت سے فارسی ایک طرح ان کے گھر کی زبان تھی۔ عربی کے بھی فاضل تھے، اگرچہ باقاعدہ نہ پڑھی تھی۔ عزیزم اسرار احمد کا نکاح خان بہادر ولایت علی کی پوتی سے ہوا تو استاد مرحوم ہی نے نکاح پڑھایا تھا اور کوئی کاغذ پرچہ سامنے رکھے بغیر۔ ماشاء اللہ، استغفر اللہ۔ نعوذ باللہ۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ اور ایسے ہی کئی اور عربی کے جملے بے تکان بولتے تھے۔ خیر خراسان بھی کہیں عرب ہی کی طرف کو ہے۔ لہٰذا عربی پر ان کا عبور جائے تعجب نہیں۔ ہاں انگریزی کی لیاقت جو انہوں نے از خود پیدا کی تھی، اس پر راقم کو بھی حیرت ہوتی تھی۔ ایک بار ایک دیہاتی منہ اٹھائے ان کی کلاس میں گھس آیا۔ حضرت نے فوراً انگریزی میں حکم دیا۔ گٹ آؤٹ۔ اسے تعمیل کرتے ہی بنی۔ علاقے کا مال افسر انگریز تھا ایک روز اسکول میں نکل آیا اور آدھا گھنٹہ گفتگو کرتا رہا۔ استاد مرحوم برابر سمجھتے گئے اور سر ہلاتے گئے۔ بیچ بیچ میں موقع بموقع یس یس اور پلیز پلیز بھی کہتے جاتے تھے۔ پرانے بزرگوں سر سید۔ حالی، شبلی وغیرہ کے متعلق سنا ہے کہ انگریزی سمجھتے خوب تھے لیکن بولنا پسند نہ کرتے تھے۔ ہمارے استاد کا بھی یہی عمل تھا۔ ہمیں انگریزی میں ان

کے تبحر کا پہلے علم نہ تھا۔ ہوا یہ کہ ایک روز ہماری انگریزی کی کلاس میں نکل آئے اور پوچھا لڑکو بتاؤ تو ماش کی دال کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں؟ سب چپ۔ کون بتاتا۔ پھر سوال کیا۔ کریلے کی انگریزی کیا ہے؟ یہ بھی کوئی نہ بتا سکا۔ سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ آخر اُستاد مرحوم نے بتایا اور "انگلش ٹیچر" کھول کر اس کی تصدیق بھی کرا دی۔ یہ کتاب جو انگریزی کے علم کا قاموس ہے، سفر و حضر میں اُستاد مرحوم کے ساتھ رہتی تھی اور بڑے بڑے انگریزی دان ان کے سامنے آتے کتراتے تھے کہ جانے کب کس ترکاری کا انگریزی نام پوچھ لیں۔ انگریزی تحریر پر ان کی قدرت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ دستخط انگریزی ہی میں کرتے تھے۔

اُستاد مرحوم نے اہل زبان ہونے کی وجہ سے طبیعت بھی موزوں پائی تھی اور ہر طرح کا شعر کہنے پر قادر تھے۔ اُردو فارسی میں ان کے کلام کا بڑا ذخیرہ موجود ہے جو غیر مطبوعہ ہونے کی وجہ سے اگلی نسلوں کے کام آئے گا۔ اس علم و فضل کے باوجود انکسار کا یہ عالم تھا کہ ایک بار اسکول میگزین میں جس کے یہ نگراں تھے، ایڈیٹر نے اُستاد مرحوم کے متعلق لکھ دیا کہ وہ سعدی کے ہم پلہ ہیں۔ انہوں نے فوراً اس کی تردید کی۔ اسکول میگزین کا یہ پرچہ ہمیشہ اپنے پاس رکھتے اور ایک ایک کو دکھاتے کہ دیکھو لوگوں کی میرے متعلق یہ رائے ہے، حالانکہ من آنم کہ من دانم۔ ایڈیٹر کو بھی جو دسویں جماعت کا طالبعلم تھا، بلا کر فہمائش کی کہ عزیزی یہ زمانہ اور طرح کا ہے۔ ایسی باتیں نہیں لکھا کرتے۔ لوگ مُردہ پرست واقع ہوتے ہیں۔ حسد کے مارے جانے کیا کیا کہتے پھریں گے۔

اہل علم، خصوصاً شعراء کے متعلق اکثر یہ سُنا ہے کہ ہمعصروں اور پیشروؤں کے کمال کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام لیتے ہیں۔ اُستاد مرحوم میں یہ بات نہ تھی۔ بہت فراخ

دل تھے۔ فرماتے۔ غالب اپنے زمانے کے لحاظ سے بہت اچھا لکھتا تھا۔ میر کے بعض اشعار کی بھی تعریف کرتے۔ امیر خسرو کے بھی معترف تھے۔ برملا کہتے کہ ذہین آدمی تھے۔ اور ان کی کہہ مکرنیاں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ امیر خسرو کی ایک غزل اُستاد مرحوم کی ایک غزل کی زمین میں ہے فرماتے انصاف یہ ہے کہ پہلی نظر میں فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کون سی بہتر ہے۔ پھر بتاتے کہ امیر خسرو مرحوم سے کہاں کہاں محاورے کی لغزش ہوئی ہے۔ اقبالؒ کے متعلق کہتے تھے کہ سیالکوٹ میں ایسا شاعر اب تک پیدا نہ ہوا تھا۔ اس شہر کو ان کی ذات پر فخر کرنا چاہیئے۔ ایک بار بتایا کہ اقبال سے میری خط و کتابت بھی رہی ہے۔ دو تین خط علامہ مرحوم کو انہوں نے لکھے تھے کہ کسی کو ثالث بنا کر مجھ سے شاعری کا مقابلہ کر لیجئے۔ راقم نے پوچھا نہیں کہ ان کا جواب آیا کہ نہیں۔

اُستاد مرحوم کو عموماً مشاعروں میں نہیں بلایا جاتا تھا کیونکہ سب پرچھا جاتے تھے، اور اچھے اچھے شاعروں کو خفیف ہونا پڑتا۔ خود بھی نہ جاتے تھے کہ مجھ فقیر کو ان ہنگاموں سے کیا مطلب۔ البتہ جوبلی کا مشاعرہ ہوا تو ہمارے اصرار پر اس میں شریک ہوئے اور ہر چند کہ مدعو نہ تھے منتظمین نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ دیوانہ کسمنڈوی۔ خیال گڑگانوی اور حسرت بانس بریلوی جیسے اساتذہ اسٹیج پر موجود تھے۔ اس کے باوجود استاد مرحوم کو سب سے پہلے پڑھنے کی دعوت دی گئی۔ وہ منظر اب تک راقم کی آنکھوں میں ہے کہ اُستاد نہایت تمکنت سے ہوئے ہوئے قدم اٹھاتے مائیک پر پہنچے اور ترنم سے اپنی مشہور غزل پڑھنی شروع کی ہے

ہے رشتۂ غم اور دلِ مجبور کی گردن
ہے اپنے لئے اب یہ بڑی دور کی گردن

ہال میں ایک سناٹا چھا گیا۔ لوگوں نے سانس روک لئے۔ اُستاد مرحوم نے

داد کے لیے صاحبِ صدر کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ ابھی تشریف نہ لائے تھے۔ کرسیٔ صدارت خالی پڑی تھی۔ دوسرا شعر اس سے بھی زوردار تھا ؎

صد حیف کہ مجنوں کا قدم اٹھ نہیں سکتا
اور دار پہ ہے حضرتِ منصور کی گردن

دوسرا مصرع تمام نہ ہوا تھا کہ داد کا طوفان پھٹ پڑا۔ مشاعرے کی چھت اڑتا سنا ضرور تھا۔ دیکھنے کا اتفاق آج ہوا۔ اب تک شعرا ایک شعر میں ایک مضمون باندھتے رہے ہیں۔ وہ بھی مشکل۔ اس شعر میں استاد مرحوم نے ہر مصرع میں ایک مکمل مضمون باندھا ہے۔ اور خوب باندھا ہے۔ لوگ اسٹیج کی طرف دوڑے۔ غالباً استاد مرحوم کی پابوسی کے لیے۔ لیکن رضاکاروں نے انہیں باز رکھا۔ اسٹیج پہ بیٹھے استادوں نے جو یہ رنگ دیکھا تو اپنی غزلیں پھاڑ دیں اور اٹھ گئے۔ جان گئے تھے کہ اب ہمارا رنگ کیا جمے گا۔ ادھر لوگوں کے اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ تیسرے شعر پر ہی فرمائش ہونے لگی۔ مقطع پڑھیے مقطع پڑھیے۔ ـــــــ چوتھے شعر پر مجمع بے قابو ہو رہا تھا کہ صدرِ جلسہ کی سواری آگئی۔ اور منتظمین نے بہت بہت شکریہ ادا کر کے استاد مرحوم کو بغلی دروازے کے باہر چھوڑ کر اجازت چاہی۔ اب ضمناً ایک لطیفہ سن لیجیے جس سے اخبار والوں کی ذہنیت عیاں ہوتی ہے۔ دوسری صبح روزنامہ "پتنگ" کے رپورٹر نے لکھا کہ جن استادوں نے غزلیں پھاڑ دی تھیں۔ وہ یہ کہتے بھی سنے گئے کہ عجب نامعقول مشاعرے میں آ گئے ہیں۔ لوگوں کی بے تحاشا داد کو اس بدباطن نے ہوٹنگ کا نام دیا اور استاد مرحوم کے اس مصرع کو ع صد حیف کہ مجنوں کا قدم اٹھ نہیں سکتا۔ بوجہ لاعلمی یا شرارت بجائے توارد کے سرقہ قرار دیا۔ بات فقط اتنی تھی کہ منتظمین نے ایڈیٹر پتنگ کے اہلِ خانہ کو مشاعرے کے پاس معقول تعداد میں نہ بھیجے تھے۔ اگر یہ بات تھی تو اسے منتظمین کے خلاف لکھنا چاہیے تھا نہ کہ استاد مرحوم کے خلاف۔ اور پھر اس قسم کے فقروں کا کیا جواز

ہے کہ اُستاد چراغ شعر نہیں پڑھ رہے تھے روئی دُھن رہے تھے۔ صحیح محاورہ روئی دھننا نہیں روئی دُھنکنا ہے۔

اُس دن کے بعد سے مشاعرے والے اُستاد مرحوم کا ایسا ادب کرنے لگے کہ اگر استاد اپنی کریم النفسی سے مجبور ہو کر پیغام بھجوا دیتے کہ میں شریک ہونے کے لئے آرہا ہوں تو وہ خود معذرت کرنے کے لئے دوڑے آتے کہ آپ کی صحت اور مصروفیات اس کی اجازت نہیں دیتیں۔ اُستاد تو اُستاد ہیں۔ ہمیں ان کے ناچیز شاگردوں کو بھی زحمہ آجاتا کہ معمولی مشاعرہ ہے۔ آپ کے لائق نہیں۔ زحمت نہ فرمائیں۔

اُستاد مرحوم کو رباعی، قصیدہ، غزل وغیرہ کے علاوہ تضمین سے خاص دلچسپی تھی۔ میونسپلٹی کے چیئرمین کے بچے کے ختنے پر جو دھوم دھامی مشاعرہ ہوا۔ اس کے لئے آپ نے غالب کی غزل کی مخمس میں تضمین کی تھی۔ اس پر بے انتہا داد ملی۔ جب یہ بند کے چوتھے اور پانچویں مصرع پر آتے لوگ سبحان اللہ اور جزاک اللہ کے ڈونگرے برساتے۔

یہ سچ ہے کہ اُستاد مرحوم کا نام اتنا مشہور نہ ہوا جتنا ان کے ہمعصروں اقبال، حفیظ، جوش وغیرہ کا۔ بات یہ ہے کہ یہ زمانہ پروپیگنڈے کا ہے اور اُستاد مرحوم نام و نمود اور چھپنے چھپانے کے قائل نہ تھے۔ ایک بار راقم نے اُستاد مرحوم کے ایما پر ان کی کچھ غزلیں مختلف رسالوں کو بھجوائی تھیں۔ ان میں سے ایک لالہ چونی لال خستہ کے لیلائی گزٹ میں آب و تاب سے چھپی لیکن باقی واپس آگئیں۔ آئندہ کے لئے منع کر دیا اور اپنی طرف اشارہ کر کے یہ شعر پڑھا۔

اے تماشاگاہِ عالم روئے تو　　　　تو کجا بہرِ تماشا می روی

یہی حال ان کے مجموعوں کا ہوا۔ اپنا کلام مضبوط ولایتی کاغذ پر لکھتے تھے۔ اور جب پورا رجسٹر ہو جاتا تو اس کی جلد بندھوا کر "جلد اوّل"، "جلد دوم" وغیرہ لکھ کر الماری میں سجا دیتے۔ مولانا کے ہاں مخطوطات کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ اور ایک بات میں تو یہ ذخیرہ برٹش میوزیم، انڈیا آفس، خدابخش لائبریری وغیرہ کے ذخیروں سے بھی ممیز اور فائق سمجھنا چاہیے۔ ان کتب خانوں میں سب مخطوطات پرانے زمانے کے ہیں بعض تو ہزار ہزار سال پرانے۔ خستہ اور بدرنگ۔ ہاتھ لگاؤ تو مٹی ہو جائیں۔ لیکن استاد مرحوم کے سبھی مخطوطات نہایت اچھی شکل میں تھے۔ اور زیادہ تر ان کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوتے۔ بیسویں صدی کے مخطوطات کا اتنا بڑا ذخیرہ غالباً کسی کے پاس نہ ہوگا۔ استاد کی چیزیں جو طباعت کے عیب سے آلودہ نہ ہوئیں، اسے بھی راقم مصلحتِ خداوندی سمجھتا ہے۔ اگر سبھی چیزیں چھپ جایا کریں تو قلمی نسخے کہاں سے آیا کریں۔ اور قلمی نسخے نہ ہوں تو لوگ ریسرچ کس چیز پر کریں۔ اور ریسرچ نہ ہو تو ادب کی ترقی رک جاتی ہے اور پی۔ ایچ۔ ڈی نقاد پیدا ہونے بند ہو جائیں۔

راقم نے ایک بار عرض کیا کہ ان نوادر کو تو کسی ریسرچ لائبریری میں ہونا چاہیے۔ فرمایا۔ میرا اپنا یہی خیال تھا اور میں نے پنجاب یونیورسٹی لائبریری کو لکھا بھی تھا۔ اور مسودات کی فہرست منسلک کی تھی۔ ان بیچاروں نے شکریہ ادا کیا۔ لیکن معذرت کی کہ فی الحال ہماری لائبریری میں جگہ کی کمی ہے۔ البتہ نعمت اللہ کباڑی مرحوم کو دہلی کے ایک علم دوست گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، اکثر ان کے گھر کے چکر کاٹتے تھے۔ اور مخطوطات جدیدہ و مفیدہ کا یہ سارا ذخیرہ اٹھانے کو تیار تھے۔ اماں بی یعنی استاد مرحوم کی منجھلی اہلیہ نے کتنی بار کہا بھی کہ اس وقت اچھا بھاؤ جا رہا ہے، اٹھوا دو لیکن استاد مرحوم نے کبھی لالچ گوارا نہ کیا۔ جواب دیا تو یہی کہ میرا مقصد جلبِ منفعت نہیں۔ خدمتِ ادب ہے۔

استاد مرحوم کا خط نہایت پاکیزہ اور شکستہ تھا۔ کسی خاص صنعت میں لکھتے تھے

جس کا نام اِس وقت راقم کے ذہن سے اتر گیا ہے۔ خوبی اس کی یہ ہے کہ صرف لکھنے والا اسے پڑھ سکتا ہے۔ راقم التحریر کے املا میں بھی جو لوگوں کو یہ خصوصیت نظر آتی ہے۔ اُدھر ہی کا فیضان ہے۔

طبیعت میں ایجاد کا مادہ تھا۔ لکیر کے فقیر نہ تھے۔ اب اسی لفظ فیضان کو لیجئے اِسے وہ ظ سے لکھتے تھے۔ ایک بار طوطا رام صیاد نے اس پر اعتراض بھی کیا۔ یہ صاحب ہوشیار پور کے رہنے والے تھے۔ اور معمولی تعلیم یافتہ تھے۔ استاد مرحوم نے چمک کر جواب دیا۔ یہ ہماری زبان ہے پیارے۔ ہم جیسا لکھیں گے وہی سند ہوگا۔ ماسٹر جی اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ بعد میں راقم کو استاد مرحوم نے ایک مستند قلمی نسخے میں فیظان ظ سے لکھا ہوا دکھایا۔ اس نسخے کا نام یاد نہیں۔ لیکن کم از کم پچیس سال پرانا ہوگا اور خود استاد مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ ان شہادتوں کے باوجود وسیع القلب اتنے تھے کہ آخر عمر میں فرمایا کرتے۔ ض سے لکھنا بھی غلط نہیں۔ اسی طرح بہت سے اور الفاظ تھے۔ جن کا تلفظ اور املا وہ رواج عام سے ہٹ کر کرتے تھے۔ کوئی انگشت نمائی کرتا تو جواب دیتے کہ ہمارے گڑگاؤں میں یونہی لکھتے اور بولتے ہیں۔ معترض چپ ہو جاتا۔

استاد مرحوم کے اوصاف حمیدہ کا حال لکھنے کے لئے ایک دفتر چاہیئے۔ اس مضمون میں اس کی گنجائش نہیں۔ مختصر یہ کہ دریا دل آدمی تھے۔ کوئی شخص کوئی چیز پیش کرتا تو کبھی انکار نہ کرتے۔ دوسری طرف اس بات کا خیال رکھتے کہ کسی کے جذبات کو ٹھیس نہ لگے۔ کوئی سائل یا حاجتمند آتا تو نہ صرف یہ کہ خود کچھ نہ دیتے۔ دوسروں کو بھی منع کر دیتے تھے کہ یہ بھی تمہاری طرح انسان ہے۔ اس کی خودداری مجروح ہوگی۔ اس شخص کو پندو نصائح سے مطمئن کرکے بھیج دیتے۔

استاد مرحوم کی طبیعت خوشامد سے نفور تھی۔ راقم کو معلوم نہیں کہ محکمہ تعلیم کے

افسروں اور ڈپٹی کمشنر کے علاوہ کہ حاکم ضلع ہونے کے لحاظ سے اولوالامر کی تعریف میں آتے ہیں۔ انہوں نے کبھی کسی کا قصیدہ کہا ہو۔ البتہ کسی افسر یا سیٹھ کے ہاں شادی ہوتو سہرا کہہ کرے جاتے اور ترنم سے پڑھ کر سُناتے۔ فرماتے یہ وضعداری ہے۔ اس کا انعام کسی نے دے دیا تو لے لیا ورنہ اصرار نہ کرتے۔ اشاعت تعلیم سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ ہیڈ ماسٹر صاحب اور انسپکٹر تعلیمات کے بچوں کو پڑھانے جایا کرتے تھے۔

اُستاد مرحوم کا مسلک صُلح کل تھا۔ جس زمانے میں مولوی محمد عمر انسپکٹر تعلیمات تھے یہ تنظیم اہل سنت کے جلسوں میں باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔ ان کی جگہ ظل حسنین امروہوی آئے تو ان کو تنظیم سے شکایتیں پیدا ہو گئیں۔ اور اثنا عشری مسجد میں دیکھے جانے لگے۔ اہل بیت کے جو مرثیے ان کے دیوان میں ہیں۔ اسی زمانے کے ہیں۔ کچھ دنوں قاضی نور احمد کا تقرر بھی اس خدمت پر رہا۔ یہ قادیانی احمدی تھے۔ اُستاد مرحوم ان دنوں برملا فرماتے کہ مجھے تو اگر اسلام کی سچی روح کہیں نظر آتی ہے تو انہی کے ہاں۔ اس سال عید کی نماز انہوں نے احمدیوں کی مسجد میں پڑھی۔ فرماتے سبھی خدا کے گھر ہیں۔ کوئی فرق نہیں۔ پنڈت رادھے شیام ہیڈ ماسٹر ان سے ہمیشہ خوش رہے۔ انہیں اُستاد مرحوم ہی سے معلوم ہوا تھا کہ کرشن جی باقاعدہ نبی تھے۔ اور تورات میں ان کی آمد کا ذکر ہے۔

موسیقی سے شغف تھا اور گلے میں لوچ بھی تھا۔ لیکن محلے والے اچھے نہیں تھے۔ اُستاد کی خواہش تھی کہ شہر سے باہر تنہا کوئی مکان ہو تو دل جمعی سے تکمیل شوق کریں۔ ویسے کبھی کبھی محفل میں ہارمونیم لے کر بیٹھ جاتے تھے کہ یہی ان کا محبوب ساز تھا۔ اور سہگل مرحوم کی مشہور غزل نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سناتے نہ بنے، سنانی شروع کر دیتے۔ ایسے موقع پر نکتہ شناس لوگ آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کر کے ایک ایک کر کے اٹھ جاتے کیونکہ اس فن کے ریاض کے لئے تنہائی ضروری ہے۔

اُستاد مرحوم ہاتھ دیکھنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اور طبیب حاذق بھی تھے۔ آخر میں طبابت تو انہوں نے ترک کر دی تھی۔ کیونکہ ایک مریض کے رشتہ داروں نے جوان کے زیر علاج تھا۔ اور ان کی تیر بہدف دوا "حکمی" کی ایک خوراک کھانے کے بعد خالق حقیقی سے جا ملا تھا۔ بے وجہ ایک فساد کھڑا کر دیا تھا۔ اور نوبت پولیس تھانے تک پہنچی تھی۔ دست شناسی کا شوق البتہ جاری رہا۔ طبابت کی طرح اس فن میں بھی نہ کسی کے شاگرد بنے نہ کوئی کتاب پڑھی۔ خود فرماتے مبدأ فیاض کی دین ہے۔ ماضی کا حال نہایت صحت سے بتاتے۔ لیکن اجنبیوں کا ہاتھ دیکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ انہی سے کھلتے جن سے دیرینہ واقفیت اور رسم و راہ ہوتی۔ مستقبل کے بارے میں ان کا اصول تھا کہ لوگوں کو صحیح بات نہ بتانی چاہیئے۔ ورنہ ان کا تقدیر اور علم غیب پر سے ایمان اُٹھ جاتا ہے۔ اس فن سے ان کی آمدنی خاصی تھی۔ اور اسی پر قانع تھے۔ اسکول کی تنخواہ بچا کر خدا کی راہ میں لوگوں کو سود پر دے دیتے تھے۔

ایسی دبدہ زیب شخصیتیں چشم فلک نے کم ہی دیکھی ہوں گی جیسے اُستاد چراغ رحمتہ اللہ علیہ تھے۔ قد پانچ فٹ سے بھی نکلتا ہوا۔ جسم بھرا بھرا خصوصاً کمر کے آس پاس۔ سر پر میل خورے کپڑے کی ٹوپی اور اس کے ساتھ کی شیروانی۔ راقم نے کبھی ان کو ٹوپی کے بغیر نہ دیکھا۔ ایک بار خود ہی فرمایا کہ ایک تو یہ خلاف تہذیب ہے۔ دوسرے کوے ٹھونگیں مارتے ہیں۔ ٹانگیں چھوٹی چھوٹی تھیں جس کی وجہ سے چال میں بچوں کی سی معصومیت تھی۔ رنگ سرمئی۔ آنکھیں سرخ و سفید اور پھر جلال ایسا کہ مائیں دیکھ کر بچوں کو چھپا لیتی تھیں۔ دانت تمباکو خوری کی کثرت سے شہید ہو گئے تھے۔ لہذا تمباکو چھوڑ دیا تھا۔ فقط نسوار کا شوق رکھا تھا۔ چشمہ لگاتے تھے۔ لیکن ہماری طرح چشمے کے غلام نہ تھے۔ بالعموم اس کے اُوپر سے دیکھتے تھے۔ سرخ کمربند میں چابیوں کا گچھا چاندی کے گھنگھروؤں کی طرح بجتا۔

دور ہی سے معلوم ہو جاتا کہ حضرت تشریف لا رہے ہیں۔ ایک ہاتھ میں چھ انگلیاں تھیں۔ اس لیے گیارہ تک بآسانی گن لیتے تھے۔ سو اس پر ایسا قابو تھا کہ جس محفل میں چاہتے بیٹھے بیٹھے سو جاتے اور خراٹے لینے لگتے۔ پھر آپ ہی آپ اٹھ بھی بیٹھتے۔ کھانے کا شوق ہمیشہ سے تھا خصوصاً دعوتوں میں۔ فرماتے کھانے میں دو خوبیاں ہونی چاہئیں۔ اچھا ہو اور بہت ہو۔ کھانے کے آداب کا ذکر کرتے تو فرماتے کہ سب سے پہلے شروع کرو اور سب سے آخر میں ختم کرو۔ جس ضیافت میں استاد مرحوم ہوتے۔ لوگ کھاتے کم، ان کی طرف رشک سے دیکھتے زیادہ تھے۔ لیکن یہ جوانی کی باتیں ہیں۔ آخر عمر میں پرہیزی کھانا کھانے لگے۔ میزبان کے ہاں پہلے سے کہلوا دیتے کہ یخنی وغیرہ کا انتظام کر لینا۔ اور میٹھے میں سوائے حلوے کے اور کچھ نہ ہو۔ چوزے کے متعلق فرماتے کہ زود ہضم ہے۔ خون صالح پیدا کرتا ہے۔ دال سے احتراز فرماتے کہ نفخ پیدا کرتی ہے۔

بذلہ سنجی استاد مرحوم کی طبیعت میں ایسے تھی جیسے باجے میں راگ۔ جیسے تلوار میں جوہر۔ "لطائف بیربل و ملا دو پیازہ" کے سب لطیفے نوک زبان تھے۔ ان سے محفلوں کو گرماتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ لطیفوں کی تخصیص نہیں۔ لوگ ان کی دوسری باتوں پر بھی ہنستے تھے۔

ایسا بڑا آدمی اور سادگی کا یہ عالم کہ کبھی خیال نہ کیا کہ لباس میلا ہے یا پیوند لگا ہے۔ فرماتے انسان کا من اجلا ہونا چاہیئے۔ تن تو ایک عارضی چولا ہے۔ اس مضمون کا کبیر کا ایک دوہا بھی پڑھتے۔ کپڑا پہننے کا سلیقہ تھا۔ ایک کالی اچکن کو پورے بیس برس تک چلایا۔ جب سردی آتی۔ اسی کو جھاڑ کر پہن لیتے۔ فرماتے۔ کپڑے کے دشمن دو ہیں۔ دھوبی اور استری۔ واقعی سچ ہے۔ یہ اچکن جو آخر میں ملگجے رنگ کی ہو گئی تھی۔ اور دور سے جرمی نظر آتی تھی۔ دھوبی اور استری کے منھ چڑھ جاتی تو کبھی کی غارت ہو گئی ہوتی۔ ایک روز اسے پہنے راقم کے ہمراہ کسی قوالی میں جا رہے تھے۔ قوالی کرنے نہیں، سننے۔ کہ چوراہے

پر رکنا پڑا۔ ایک مرد شریف نے نہ جانے کیا خیال کر کے ان کے ہاتھ پر ٹکا رکھ دیا۔ راقم کچھ کہنے کو تھا کہ اُستاد مرحوم نے اشارے سے منع کر دیا۔ اور ٹکا جیب میں ڈال لیا۔ یہی حال جوتے کا تھا۔ فرماتے جوتا ایسی چیز ہے کہ کبھی ناکارہ ہو ہی نہیں سکتا۔ تلا پھٹ جاتا تو نیا لگوا لیتے۔ اُوپر کا حصہ پھٹ جاتا تو اسے بدلوا لیتے۔ داڑھی مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرح پُر رعب، گھنی اور لمبی۔ اسے ترشواتے نہیں تھے۔ فرماتے خدا کا نور ہے۔ بعض لوگوں کو گمان تھا کہ پیسہ بچانے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ لیکن یہ غلط ہے۔ ان کے پاس پیسے بہت تھے اور جمع کرنے کا شوق بھی تھا۔ لیکن پیسے کی طمع ان میں نہ تھی۔

اُستاد مرحوم یوں تو اپنے سبھی شاگردوں سے محبت کرتے تھے۔ حاجی امام دین سوختہ بیکری والے۔ خلیفہ اے۔ ڈی۔ مقراض مالک جنٹلمین ہیئر کٹنگ سیلون۔ حسین بخش مدعی، عرائض نویس وغیرہ سبھی ان کے اخلاق حسنہ اور الطاف عمیم کی گواہی دیں گے لیکن راقم سے ان کو ربطِ خاص تھا۔ فرماتے میرے علم و فضل کا صحیح جانشین تُو ہو گا۔ رات کا کھانا اکثر راقم کے ساتھ کھاتے اور وقت کی پابندی کا لحاظ اس درجہ تھا کہ ادھر ہم دسترخوان پر بیٹھے ادھر اُستاد مرحوم پھاٹک سے نمودار ہوتے۔ بچوں سے لگاؤ تھا۔ جو بچہ ہمت کر کے ان کے قریب آتا انعام پاتا۔ ایک بار راقم کے بڑے بھتیجے کو ایک اکنّی دی تھی۔ وہ اب تک اُستاد مرحوم کی یادگار کے طور پر رکھے ہوئے ہے۔

ایک دن فرمایا۔ ایک بات کہوں؟ راقم نے عرض کیا۔ فرمایئے۔ بولے۔ جھوٹ تو نہ سمجھو گے؟ راقم نے کہا۔ خانہ زاد کی کیا مجال! فرمایا۔ تو کان کھول کر سنو۔ میری نظر میں تم جوش، جگر وغیرہ بلکہ آج کل کے سبھی شاعروں سے اچھا لکھتے ہو۔ راقم نے آبدیدہ ہو کر ان کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور عرض کیا کہ سب آپ کا فیض ہے۔ ورنہ بندہ کچھ بھی نہ تھا۔ قارئین اسی سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ اُستاد مرحوم کی نظر کتنی گہری تھی اور وہ کتنے صاحب

ان کا یہ قول راقم نے اکثر لوگوں کو سنایا۔ بعضوں نے جو انصاف پسند تھے۔ اعتراف کیا کہ ہاں ایسے اُستاد کا ایسا شاگرد کیوں نہ ہو۔ کچھ ایسے بھی تھے۔ جنہوں نے کہا کہ یہ بات شاید اُستاد نے فقط تمہارا دل بڑھانے کو کہی ہو۔ ان سے راقم کیا بحث کرتا۔ یہی کہا کہ آپ جو فرمائیں بجا ہے۔ لیکن دل میں سوچا کہ جس شخص کو زندگی بھر تملّق اور زمانہ سازی سے واسطہ نہ رہا ہو وہ اس بات میں کیوں مبالغہ کرنے لگا۔ اور پھر اپنے ایک ادنیٰ شاگرد کے لئے؟

۱۹۶۳ء عجب ظالم سال تھا۔ اس میں دُنیا کو ایک طرف صدر کینیڈی کا داغ دیکھنا پڑا اور دوسری طرف علم و فضل اور جود و سخا کا یہ آفتاب جس نے واقعی چراغ بن کر زمانے کو روشن کیا تھا۔ غروب ہو گیا۔ عمر عزیز کے ۸۲ برس ابھی پورے نہ ہوتے تھے۔ کچھ دن باقی ہی تھے ہائے اُستاد ؎

تم کون سے ایسے تھے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

وصال ٹانڈلیانوالہ ہی میں ہوا جہاں اُستاد مرحوم پاکستان بننے کے بعد مقیم ہو گئے تھے اور گھی کی آڑھت کرتے تھے۔ سُنا ہے معمولی بُخار ہوا تھا۔ اور ہر چند کہ اپنے ہی مجربات سے علاج کیا۔ طبیعت بگڑتی ہی گئی۔ راقم کو خبر ملی تو دنیا آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ بے ساختہ زبان سے نکلا۔ "ہائے الدین کا چراغ بجھ گیا" عدد گنے تو پورے ۱۳۸۳ھ کیسی برجستہ اور سہل ممتنع تاریخ ہے۔ آج اُستاد مرحوم زندہ ہوتے تو اس کی داد دیتے۔

اُستاد کے خاندان کی کیفیت بھی مختصر الفاظ میں عرض کروں۔ چار شادیاں تھیں۔ پانچویں عمر بھر نہ کی۔ کیونکہ شرع سے انحراف منظور نہ تھا۔ آہ بھر کر فرماتے جب تک چاروں زندہ ہیں۔ ایک اور کیسے کروں۔ شرع میں چار کی اجازت بھی اس شرط کے ساتھ

ہے۔ کہ سلوک یکساں ہو۔ سو الحمد اللہ کہ چاروں کا سلوک ان سے یکساں تھا لیکن اُستاد بھی ایسے صابر تھے کہ کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لاتے۔ اولاد صرف ایک سے ہوئی۔ اُمید ہے کہ عزیز مکرم ہدایت علی ان کے فرزند اکبر جو خود بھی موزوں طبع ہیں۔ اور فراغ تخلص کرتے ہیں۔ اپنے والد کے صحیح جانشین ثابت ہوں گے۔ رسمی تعلیم ان کی زیادہ نہیں۔ صفائے باطن کے مراحل فقیروں کے تکیوں اور قوالی کی محفلوں میں طے کئے۔ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ اُستاد مرحوم کے وصال کے بعد سرِ عام شراب پینا انہوں نے ترک کر دیا ہے۔ اور افیم بھی اب اعتدال سے کھاتے ہیں۔ یہ بھی اپنے نامی والد کی طرح روپے کو ہاتھ کا میل سمجھتے ہیں۔ لہذا تعزیت کے خط کے جواب میں فوراً پانچ سو روپے منگوا بھیجے۔ راقم نے لکھا کہ عزیزی۔ اس خانوادے پر متاع دل و جان نثار کر چکا ہوں۔ روپیہ کیا پیچھے رہ گیا؟ تم یوں کرو کہ اُستاد مرحوم کی قبر پر سبز چادر چڑھا کر بیٹھ جاؤ۔ خدا برکت دے گا۔ اور وہیں رزق پہنچا دیا کرے گا۔ اور اگر فتح علی مبارک علی راضی ہو جائیں تو سبحان اللہ سال کے سال عرس سراپا قدس کا اہتمام بھی کرو۔ معلوم نہیں یہ خط ان کو ملا کہ نہیں کیونکہ پھر جواب نہیں آیا اور راقم کو بھی مکروہات دنیوی سے اتنی فرصت نہ ملی کہ دوبارہ خط لکھتا۔

فیض اور میں

(افکار کے فیض نمبر کے لئے)

بڑے لوگوں کے دوستوں اور ہم جلیسوں میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اس دوستی اور ہم جلیسی کا اشتہار دے کر خود بھی ناموری حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسرے وہ عجز و فروتنی کے پتلے جو شہرت سے بھاگتے ہیں کم از کم اپنے ممدوح کی زندگی میں۔ ہاں اس کے بعد رسالوں کے ایڈیٹروں کے پُرزور اصرار پر انہیں اپنے تعلقات کو الم نشرح کرنا پڑے تو دوسری بات ہے۔

ڈاکٹر نذیر الدین فقیر کو لیجئے۔ جیسے اور پروفیسر ہوتے ہیں ویسے ہی یہ تھے۔ لوگ فقط اتنا جانتے تھے کہ علامہ اقبال کے ہاں اُٹھتے بیٹھتے تھے۔ سو یہ بھی خصوصیت کی کوئی بات نہیں۔ یہ انکشاف علامہ کے انتقال کے بعد ہوا کہ جب کوئی فلسفے کا دقیق مسئلہ ان کی سمجھ میں نہ آتا تو انہی سے رجوع کرتے تھے۔ ڈاکٹر نذیر الدین فقیر نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک روز آدھی رات کو میں چونک کر اُٹھا اور کھڑکی میں سے جھانکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ علامہ مرحوم کا خادم خاص علی بخش ہے۔ میں نے پوچھا "خیریت؟" جواب ملا "علامہ صاحب نے یاد فرمایا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس وقت؟" بولا۔ "جی ہاں اس وقت اور تاکید کی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو لے کر آنا۔" میں حاضر ہوا تو اپنے لحاف میں جگہ دی اور فرمایا۔ "آج ایک صاحب نے گفتگو میں رازی کا ذکر کیا۔ تم جانتے ہو میں تو شاعر آدمی ہوں۔ آخر کیا کیا پڑھوں؟ اس وقت یہ پوچھنے کو تکلیف دی ہے کہ یہ رازی کون صاحب تھے اور ان کا

فلسفہ کیا تھا۔" میں دل ہی دل میں ہنسا کہ دیکھو اللہ والے لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ بہرحال تعمیل ارشاد میں میں نے امام فخرالدین رازی اور ان کے مکتب فکر کا سیر حاصل احاطہ کیا اور اجازت چاہی۔ علامہ صاحب دروازے تک آتے آبدیدہ ہو کر رخصت کیا اور کہا "تم نے میری مشکل آسان کر دی۔ اب اس شہر میں اور کون رہ گیا ہے جس سے کچھ پوچھ سکوں۔"

اگلی اتوار کو زمیندار کا پرچہ کھولا تو صفحہ اول پر علامہ موصوف کی نظم تھی جس میں وہ مصرع ہے :-

عزیب اگرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق

ہرچند میں نے واضح کر دیا تھا کہ رازی کا فلسفہ خاصا پیش پا افتادہ ہے۔ دقیق ہرگز نہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ علامہ مرحوم کو ایسا ہی لگا۔

مدرسہ علمیہ شرطیہ موچی دروازے کے پرنسپل مرزا اللہ دتہ خیال نے جو چھ ماہ میں میٹرک اور دو سال میں بی۔ اے پاس کرانے کی گارنٹی لیتے ہیں۔ ماہ نامہ تصویر بتاں" میں پہلی بار اس بات کا اعتراف کیا کہ علامہ مرحوم کو مثنوی مولانا روم کے بعض مقامات میں الجھن ہوتی تو مجھے یاد فرماتے تھے۔ ایک بار میں نے عرض کیا کہ آپ منشی فاضل کیوں نہیں کر لیتے۔ تمام علوم آپ کے لئے پانی ہو جائیں گے۔ بولے:" اس عمر میں اتنی محنت شاقہ نہیں کر سکتا۔" بعد میں میں نے سوچا کہ واقعی شعرا تلامیذ الرحمٰن ہوتے ہیں۔ ان کو علم اور ریسرچ کے جھمیلوں میں نہیں پڑنا چاہیئے۔ یہ تو ہم جیسے سر پھروں کا کام ہے۔

علامہ کے ایک جگری دوست رنجور فیروز پوری کو بھی لوگ گوشہ گمنامی سے نکال لاتے۔ ایک بصیرت افروز مضمون میں آپ نے لکھا "خاکسار نے اپنے لئے شاعری کو کبھی ذریعہ عزت نہیں جانا۔ بزرگ ہمیشہ سے تک بندی کرتے آئے تھے۔ اس میں خدا

نے مجھے برکت دی۔ جو ٹوٹا پھوٹا کلام بسبیلِ ارتجال کہتا تھا۔ علامہ صاحب کی نذر کر دیتا تھا۔ اب بھی دیکھتا ہوں کہ ارمغانِ حجاز وغیرہ کتابوں میں سینکڑوں ہی مصرعے جو اس ہیچ مداں کج مج زباں نے علامہ کے گوش گزار کئے تھے۔ نگینوں کی طرح چمک رہے ہیں
حکیم عزرائیلی مصنف طب بقراطی نے نمایندہ "صبح وشام" کو انٹرویو دیا تو بتایا کہ ایک زمانے میں حکیم الامت کو بھی طب کا شوق ہوا۔ بندہ نسخہ لکھتا اور علامہ مرحوم پڑیاں بناتے اور جوشاندے کوٹتے چھانتے۔ اس دوران اگر فکر سخن میں مستغرق ہو جاتے تو کبھی کبھی ہاون دستے میں اپنا انگوٹھا پھوڑ بیٹھتے۔ دوسرے روز عقیدتمند پوچھتے کہ یہ کیا ہوا تو فقط مسکرا کر انگشت شہادت آسمان کی طرف بلند کر دیتے۔
عام لوگوں کا یہ خیال تھا کہ علامہ مرحوم آخری سالوں میں کبوتر بازی اور پہلوانی نہیں کرتے تھے اور بینڈھے لڑانے کا شوق بھی ترک کر دیا تھا۔ صحیح صورت حال سے میاں معراج دین گوجرانوالوی نے رسالہ "غزل الغزلات" کے اقبال نمبر میں پردہ اُٹھایا۔ پھر علامہ مذکور کے احوال میں اکثر آیا ہے کہ فلاں بات سُنی اور آبدیدہ ہو گئے۔ فلاں ذکر ہوا اور آنسوؤں کا تار بندھ گیا۔ اس کا بھید بھی علامہ مرحوم کے ایک اور قریبی دوست ڈاکٹر عین الدین ماہر امراض چشم نے کھولا۔
اسی زمرے میں ڈاکٹر محمد موسیٰ پرنسپل بانگ درا ہومیو پیتھک کالج گڑھی شاہو کو رکھیے۔ جنھوں نے علامہ اقبال مرحوم کی زندگی کے ایک اور غیر معروف گوشے کو بے نقاب کیا۔ اپنی کتاب "تسہیل الہومیوپیتھی" کے دیباچے میں رقم طراز ہیں یہ لوگوں کا یہ گمان غلط ہے کہ ڈاکٹر اقبال فقط نام کے ڈاکٹر تھے۔ اس عاجز کا مطالعہ اتنا نہیں کہ ان کے شاعرانہ مقام پر گفتگو کر سکے۔ ہاں اتنا وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ مرض کی تشخیص میں اپنے بعد میں نے انہی کو دیکھا۔ بعض اوقات دواؤں کے ضمن میں بھی ایسے قابل قدر مشورے دیتے کہ یہ عاجز اپنے تبحر علمی کے باوجود حیران رہ جاتا۔ بہرحال شاعر تو ہمارے ہاں اب بھی

اچھے اچھے پاتے جاتے ہیں۔ میرے نزدیک علامہ مرحوم کی رحلت ہومیوپیتھی طب کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ میں مریضوں پر توجہ دیتا اور وہ ایک کونے میں بیٹھے حقہ پیتے رہتے۔ تاہم اس عاجز کے مطب کی کامیابی میں جو مایوس مریضوں کی آخری امید گاہ ہے۔ اور جہاں خالص جرمن ادویات بکفایت فراہم کی جاتی ہیں۔ ان کے نام نامی کا بڑا دخل تھا۔ جاننے والے جانتے ہیں۔ کہ آپ نے اپنی ایک مشہور تصنیف کا نام بھی عاجز کے مطب کے نام پر رکھا۔

فیض صاحب کے متعلق کچھ لکھتے ہوئے مجھے تامل ہوتا ہے۔ دنیا حاسدانِ بد سے خالی نہیں۔ اگر کسی نے کہہ دیا کہ ہم نے تو اس شخص کو کبھی فیض صاحب کے پاس اٹھتے بیٹھتے نہیں دیکھا تو کون ان کا قلم پکڑ سکتا ہے۔ احباب پُر زور اصرار نہ کرتے تو یہ بندہ بھی اپنے گوشۂ گمنامی میں مست رہتا۔ پھر بعض باتیں ایسی بھی ہیں کہ لکھتے ہوئے خیال ہوتا ہے کہ آیا یہ لکھنے کی ہیں بھی یا نہیں۔ مثلاً یہی کہ فیض صاحب جس زمانے میں پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر تھے۔ کوئی اداریہ اس وقت تک پریس میں نہ دیتے تھے۔ جب تک مجھے دکھا نہ لیتے۔ کئی بار عرض کیا کہ ماشاءاللہ آپ خود اچھی انگریزی لکھ لیتے ہیں۔ لیکن وہ نہ مانتے اور اگر میں کوئی لفظ یا فقرہ بدل دیتا تو ایسے ممنون ہوتے کہ خود مجھے شرمندگی ہونے لگتی۔ پھر فیض صاحب کے تعلق سے وہ راتیں یاد آتی ہیں۔ جب فیض ہی نہیں، بخاری، سالک، خلیفہ عبدالحکیم وغیرہ ہم سبھی ہم پیالہ و ہم نوالہ دوست راوی کے کنارے ٹہلتے رہتے اور ساتھ ہی ساتھ علم و ادب کی باتیں بھی ہوتی رہتیں۔ یہ حضرات مختلف زاویوں سے سوال کرتے اور یہ بندہ اپنی فہم کے مطابق جواب دے کر ان کو مطمئن کر دیتا۔ اور یہ بات تو نسبتاً حال کی ہے کہ ایک روز فیض صاحب نے صبح صبح مجھے آن پکڑا اور کہا۔ ایک کام سے آیا ہوں۔ ایک تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یورپ میں آج کل آرٹ کے کیا رجحانات،

ہیں۔ اور آرٹ پیپر کیا چیز ہوتی ہے۔ دوسرے میں واٹر کلر اور آئیل پینٹنگ کا فرق معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ ٹھمری اور دادرا کا فرق بھی چند لفظوں میں بیان کر دیں تو اچھا ہے۔"
میں نے چائے پیتے پیتے سب کچھ عرض کر دیا۔ اُٹھتے اُٹھتے پوچھنے لگے "ایک اور سوال ہے۔ غالب کس زمانے کا شاعر تھا۔ اور کس زبان میں لکھتا تھا؟" وہ بھی میں نے بتایا۔ اس کے بعد کئی ماہ بعد تک ملاقات نہ ہوئی۔ ہاں اخبار میں پڑھا کہ لاہور میں آرٹ کونسل کے ڈائرکٹر ہو گئے ہیں۔ غالباً اس نوکری کے انٹرویو میں اس قسم کے سوال پوچھے جاتے ہوں گے۔

اکثر لوگوں کو تعجب ہوتا ہے کہ نقشِ فریادی کا رنگِ کلام اور ہے اور فیض صاحب کے بعد کے مجموعوں "دست صبا" اور "زنداں نامہ" کا اور۔ اب چونکہ اس کا پس منظر راز نہیں رہا۔ اور بعض حلقوں میں بات پھیل گئی ہے۔ لہٰذا اسے چھپانے کا کچھ فائدہ نہیں۔ فیض صاحب جب جیل گئے ہیں تو ویسے تو ان کو زیادہ تکلیف نہیں ہوئی۔ لیکن کاغذ قلم ان کو نہیں دیتے تھے۔ اور نہ شعر لکھنے کی اجازت تھی۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ ان کی آتش نوائی پر قدغن رہے۔ اور لوگ انہیں بھول بھال جائیں۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں تدبیر کنندہ تقدیر زنندہ۔ فیض صاحب جیل سے باہر آئے تو مسلم "ناگہ لے کر سیدھے یہاں تشریف لائے اور ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد کہنے لگے" اور تو سب ٹھیک ہے لیکن سوچتا ہوں۔ میرے ادبی مستقبل کا اب کیا ہوگا۔" میں نے مسکراتے ہوئے میز کی دراز میں سے کچھ مسودے نکالے اور کہا یہ میری طرف سے نذر ہیں۔ پڑھتے جاتے تھے۔ اور ان ہوتے جاتے تھے۔ فرمایا "بالکل یہی جذبات میرے دل میں آتے تھے۔ لیکن ان کو قلم بند نہ کر سکتا تھا۔ آپ نے اس خوبصورتی سے ان کو پابند نے کیا ہے کہ مجھے اپنا ہی کلام معلوم ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "برادر عزیز! بنی آدم اعضائے یک دیگر اند۔ تم پر جیل میں

جو گزرتی تھی۔ اسے میں یہاں بیٹھے بیٹھے محسوس کر لیتا تھا۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔ بہرحال اب اس کلام کو اپنا ہی سمجھو بلکہ اس میں میں نے تخلص بھی تمہارا ہی باندھا ہے۔ اور ہاں نام بھی میں تجویز کئے دیتا ہوں۔ آدھے کلام کو دستِ صبا کے نام سے شائع کرو۔ اور آدھے کو "زنداں نامہ" کا نام دو"۔ اس پر بھی ان کو تامّل رہا۔ بولے "یہ بُرا سا لگتا ہے کہ ایسا کلام جس پر ایک محبِ صادق نے اپنا خونِ جگر ٹپکایا ہو اپنے نام سے منسوب کر دوں۔ میں نے کہا "فیض میاں! دُنیا میں چراغ سے چراغ جلتا آیا ہے۔ شیکسپیئر بھی تو کسی سے لکھوایا کرتا تھا۔ اس سے اس کی عظمت میں کیا فرق آیا؟" اس پر لاجواب ہو گئے اور رقت طاری ہو گئی۔

فیض صاحب میں ایک اور بات میں نے دیکھی۔ وہ بڑے ظرف کے آدمی ہیں۔ ایک طرف تو انہوں نے کسی پر بھی یہ راز افشا نہ کیا کہ یہ مجموعے ان کا نتیجہ فکر نہیں۔ دوسری طرف جب لینن انعام لے کر آئے تو تمغہ اور آدھے روبل میرے سامنے ڈھیر کر دیئے کہ اس کے اصل حق دار آپ ہیں۔ اس طرح کے اور بہت سے واقعات ہیں۔ بیان کرنے لگوں تو کتاب ہو جائے۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا نمود و نمائش سے اس بندے کی طبیعت ہمیشہ نفور رہی ہے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

جنتری نئے سال کی

ع آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج۔ یعنی بلبل بولتا تھا یا بولتی تھی تو لوگ جان لیتے تھے کہ بہار آگئی ہے۔ ہم نئے سال کی آمد کی فال جنتریوں سے لیتے ہیں۔ ابھی سال کا آغاز دور ہوتا ہے کہ بڑی بڑی مشہور عالم، مفید عام جنتریاں دوکانوں پر آن موجود ہوتی ہیں۔ بعض لوگ جنتری نہیں خریدتے۔ خدا جانے سال کیسے گزارتے ہیں۔ اپنی قسمت کا حال، اپنے خوابوں کی تعبیر، اپنا ستارہ (چاند سورج وغیرہ بھی) کیسے معلوم کرتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ جنتری اپنی ذات سے ایک قاموس ہوتی ہے۔ ایک جنتری خریدلو اور دنیا بھر کی کتابوں سے بے نیاز ہو جاؤ۔ فہرست تعطیلات اس میں، نماز عید اور نماز جنازہ پڑھنے کی تراکیب، جانوروں کی بولیاں، دائمی کیلنڈر، محبت کے تعویذ، انبیائے کرام کی عمریں۔ اولیائے کرام کی کرامتیں، مکڑی کی پیمائش کے طریقے، کون سا دن کس کام کے لئے موزوں ہے۔ فہرست عرس ہائے بزرگان دین، صابن سازی کے گر، شیخ سعدی کے اقوال، چینی کے برتن توڑنے اور شیشے کے برتن جوڑنے کے نسخے، اعضا پھڑکنے کے نتائج۔ کرۂ ارض کی آبادی، تاریخ وفات نکالنے کے طریقے۔ یہ محض چند مضامین کا حال ہے۔ کوزے میں دریا بند ہوتا ہے اور دریا میں کوزہ۔ یوں تو سبھی جنتریاں مفید مضامین کی پوٹ ہوتی ہیں، ہر ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے۔ لیکن روشن ضمیر جنتری (جیبی) کو خاص شہرت حاصل ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے اسی کا تازہ ترین ایڈیشن ہے۔

ایک باب اس میں ہے "کون سا دن کون سے کام کے لئے موزوں ہے"۔

ہفتہ :- سفر کرنے، بچوں کو اسکول میں داخل کرانے کے لئے۔

اتوار :- شادی کرنے، افسروں سے ملاقات کرنے کے لئے۔

بدھ :- نیا لباس پہننے، غسل صحت کے لئے۔

جمعرات :- حجامت بنانے، دعوت احباب کے لئے۔

جمعہ :- غسل اور شادی وغیرہ کرنے کے لئے۔

ہم نے دیکھا ہے کہ لوگ اندھا دھند جس دن جو کام چاہیں شروع کر دیتے ہیں۔ یہ جنتری سب کے پاس ہو تو زندگی میں انضباط آجائے۔ ہفتے کا دن آیا اور سبھی لوگ سوٹ کیس اُٹھا کر سفر پر نکل گئے۔ جو نہ جا سکے وہ بچوں کو اسکول میں داخل کرانے پہنچ گئے۔ اس سے غرض نہیں کہ اسکول کھلے ہیں یا نہیں یا کسی کے بچے ہیں بھی کہ نہیں۔ جدھر دیکھو بھیڑ لگی ہے۔ اتوار کو ہر گھر کے سامنے جھولداریاں تنی ہیں۔ اور ڈھولک بج رہی ہے۔ لوگ سہرے باندھنے کے بعد جنتری ہاتھ میں لئے افسروں سے ملاقات کرنے چلے جا رہے ہیں۔ بدھ کو سبھی حماموں میں پہنچ گئے۔ اور جمعرات کو لوگوں نے حجامت بنوائی، اور دوستوں کے پیچھے پیچھے پھر رہے ہیں کہ ہمارے ہاں آکر دعوت کھا جاؤ۔ جمعہ کو نکاح ثانی کا نمبر ہے۔ جو لوگ اس منزل سے گزر چکے ہوں وہ دن بھر نل کے نیچے بیٹھ کر نہائیں کہ شاروں کا حکم یہی ہے۔

ہم جو خواب دیکھتے ہیں وہ بالعموم عام قسم کے ہوتے ہیں اور صبح تک یاد بھی نہیں رہتے۔ جنتری سے معلوم ہوا کہ خوابوں میں بھی بڑے تنوّع کی گنجائش ہے۔ خواب میں پھانسی پانے کا مطلب ہے بُلند رتبہ حاصل ہونا۔ افسوس کہ ہم نے خواب تو کیا اصل زندگی میں بھی کبھی پھانسی نہ پائی۔ بلند مرتبہ نہ مل سکنے کی اصل وجہ اب معلوم ہوئی۔ من نہ کردم شما حذر بکنید

اسی طرح گھوڑا دیکھنے کا مطلب ہے۔ دولت حاصل کرنا۔ قیاس کہتا ہے کہ مطلب وکٹوریہ کے گھوڑے سے نہیں۔ ریس کے گھوڑے سے ہے۔ خچر دیکھنے سے مراد ہے سفر پیش آنا۔ جو لوگ ہوائی جہاز سے سفر کرتے ہیں ان کو ہوائی جہاز دیکھنا چاہیئے۔ بلی کا پنجہ مارنا بیماری کے آنے کی علامت ہے۔ سانپ کا گوشت کھانا۔ دشمن کا مال حاصل ہونے کی۔ خواب میں کان میں چیونٹی گھس آئے تو سمجھئے موت قریب ہے۔ (خواب کے علاوہ گھس آئے تو چنداں حرج نہیں سرسوں کا تیل ڈالئے نکل آئے گی) اپنے سر کو گدھے کا سر دیکھنے کا مطلب ہے۔ عقل کا جاتے رہنا۔ یہ تعبیر ہم خود بھی سوچ سکتے تھے۔ کوئی آدمی اپنے سر کو گدھے کا سر (خواب میں بھی) دیکھے گا، اس کے متعلق اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ خواب میں مُردے سے مصافحہ کرنے کی تعبیر ہے۔ درازی عمر، خدا جانے یہاں عمرِ فانی سے مراد ہے یا عمرِ جاودانی سے۔

ایک باب اس میں جسم کے اعضا کے پھڑکنے اور ان کے عواقب کے بارے میں بھی ہے۔ آنکھ پھڑکنا تو ایک عام بات ہے۔ رخسار، شانۂ راست، گوشِ چپ انگشتِ چہارم، زبان، گلا، گردن بجانب چپ، ٹھوڑی، بغلِ راست وغیرہ۔ ان پچاسی اعضا میں سے ہیں۔ جن کے پھڑکنے پر نظر رکھنی چاہیئے۔ ان میں سے بعض کے نتائج ایسے ہیں کہ ہم نقل کر دیں تو فحاشی کی زد میں آ جائیں۔ ایک دو امور البتہ فاضل مرتبین نظر انداز کر گئے۔ نگہ انتخاب کی پسلی پھڑک اُٹھنا استادوں کے کلام میں آیا ہے۔ اس کا نتیجہ نہیں دیا گیا۔ ہماری رگِ حمیت بھی کبھی کبھی پھڑک اُٹھتی ہے۔ اس کے عواقب کی طرف بھی یہ جنتری رہنمائی نہیں کرتی۔ یہ نقائص رفع ہونے چاہئیں۔

یہ معلومات تو شاید کہیں اور بھی مل جائیں لیکن اس جنتری کا مغز محبت کے عملیات اور تعویذات ہیں جو حکمی تاثیر رکھتے ہیں۔ قیس میاں کی نظر سے ایسی کوئی جنتری

گزری ہوتی تو جنگلوں میں مارے مارے نہ پھرتے۔ ایک نسخہ حاضر ہے۔

"محبت کے مارے کو چاہیئے کہ ۱۲ مارچ کو بوقت ایک گھڑی بعد طلوع آفتاب مشرق کی طرف منہ کر کے نقش ذیل کو نام مطلوب مع والدہ مطلوب الّو کے خون سے لکھ کر اپنے دہنے بازو پر باندھے اور مطلوب کو ۲۰ مارچ بوقت صبح ایک گھڑی ۵۴ پل پر بعد طلوع آفتاب اپنا سایہ دے۔ مطلوب فوراً مشتاق ہو جائے گا۔

۹۱، ۱۱م و م ۱۰ع ۱۱ ع ۱۱

نام مطلوب مع والدہ مطلوب، اپنا نام مع نام والدہ

یہاں بعض باتیں جی میں آتی ہیں۔ اگر مطلوب یا محبوب بات نہیں کرتا تو اس کی والدہ اور دیگر رشتہ داروں کے نام کیسے معلوم کئے جائیں؟ پھر الّو کیسے پکڑا جائے اور ۲۰ مارچ کو بوقت صبح عین ایک گھڑی ۵۴ پل بعد طلوع آفتاب مطلوب کو کیسے مجبور کیا جائے کہ طالب کے سایہ میں آئے۔ ان باتوں کا اس جنتری میں کوئی ذکر نہیں۔ ہاں جنتری کے پبلشر نے جنتر منتر مکمل نامی جو کتاب بقیمت چھ روپے شائع کی ہے۔ اس میں ان کی تفصیل ملے گی۔

جو لوگ ہماری طرح تن آسان ہیں۔ محبت میں اتنا کشٹ نہیں اٹھا سکتے ان کے لئے مرتب جنتری نے کچھ آسان تر عمل بھی دیتے ہیں۔ جن کی بدولت محبوب قدموں پر تو آکر خیر نہیں گرتا لیکن مائل ضرور ہو جاتا ہے۔ ان میں سے ایک تعویذ ہے جسے ہر روز کاغذ کے چالیس ٹکڑوں پر لکھ کر اور نیچے طالب و مطلوب کے نام درج کر کے آٹے کی گولیوں میں لپیٹ کر دریا میں ڈالنا چاہیئے۔ اور چالیس دن تک یہی کرنا چاہیئے۔ ہم نے حساب لگایا ہے۔ از راہِ کفایت آدھے تولے کی گولی بھی بنائی جائے تو ایک پاؤ روزانہ یعنی دس سیر آٹے میں محبوب کو راضی کیا جا سکتا ہے۔ جو حضرت اس میں بھی محنت کریں۔ اور اپنی محبت کو بالکل پاک رکھنا چاہیں۔ وہ ایک اور عمل کی طرف رجوع کر سکتے

ہیں۔ وہ یہ کہ "جب بھی محبوب سامنے آئے۔ آہستہ سے دل میں بسم اللہ الصمدُ دس بار پڑھیں اور آخر میں محبوب کی طرف منہ کر کے پھونک ماریں۔ اس طرح کہ مُنہ کی ہوا اس کے کپڑوں کو چھو سکے۔ پندرہ بیس مرتبہ ایسا کرنے سے اس کے دل میں قرار واقعی محبت پیدا ہو جائے گی"]

یہ عمل بظاہر تو آسان معلوم ہوتا ہے۔ لیکن عملاً ایسا آسان بھی نہیں۔ اوّل تو محبوب کو اتنی دیر سامنے کھڑا رہنے پر مجبور کرنا کہ آپ دس بار عمل پڑھ کر پھونکیں مار سکیں اور وہ بھاگے نہیں۔ اپنی جگہ ایک مسئلہ ہے۔ پھر آپ جو پھونکیں ماریں گے اس کی بنا۔ پر محبوب کیا رائے قائم کرے گا۔ اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ زیادہ شوقین مزاج ان دونوں سے قطع نظر کر کے "محبت کا سرمہ" استعمال کر سکتے ہیں۔ جس کا بنانا تھوڑی محنت تو ضرور لے گا لیکن اس کا جادو بھی عالمگیر ہے۔ یعنی صرف محبوب ہی پر کاری اثر نہیں کرتا بلکہ لکھنے والے نے لکھا ہے کہ یہ سرمہ ڈال کر "جس کی طرف بھی صبح سویرے دیکھے وہی محبت میں مبتلا ہو جائے گا"

یہ سرمہ بنانے کے لیے حاجتمند کو ۱۹ر فروری کا انتظار کرنا پڑے گا۔ اس روز وہ بوقت طلوعِ آفتاب پرانی داتن کو جلا کر اس کی راکھ میں چمگادڑ کا خون ملائے اور اس سے یہ نقش بوقت صبح ایک گھڑی ۵ پل بعد طلوعِ آفتاب لکھے اور اس پر سورۂ فلق گیارہ سو بار پڑھے۔ پھر نئے چراغ میں روغن کنجد (تل کا تیل) ڈال کر جلائے اور اس کی سیاہی آنکھوں میں ڈالے" حسب ہدایت ایک صاحب نے یہ سرمہ دنبالہ دار لگایا تھا۔ اتنا ہم نے بھی دیکھا کہ محبوب انہیں دیکھتے ہی ہنس دیا۔ آگے کا حال ہمیں معلوم نہیں۔

یہی نہیں، صابن اور تیل تیار کرنے، بوٹ پالش بنانے، کھٹمل اور مچھر مارنے

اور مشہور عام ادویہ کی نقلیں تیار کرنے کی ترکیبیں بھی اس میں درج ہیں۔ لوگ اکثر شکایت کرتے ہیں کہ اردو میں کوئی انسائیکلوپیڈیا نہیں۔ معلومات کی کتاب نہیں۔ انسائیکلوپیڈیا کیا ہونی ہے۔ بے ادب بشرط منہ نہ کھلوائیں۔ ہم نے انسائیکلوپیڈیا برٹینکا وغیرہ دیکھی ہیں۔ الم غلم مضامین کا طومار ہے۔ اہل دل کے مطلب کی ایک بات بھی نہیں۔ نہ نسخے نہ تعویذ۔ نہ عرسوں کی تاریخیں نہ محبت کے عملیات نہ خواب نہ خوابوں کی تعبیریں۔ ہمارا یہ دستور ہوگیا ہے کہ باہر کی چیز کو ہمیشہ اچھا جانیں گے۔ اپنے ہاں کے سونے کو بھی مٹی گردانیں گے۔

نجات کا طالب غالبؔ

(چند خطوط)

(۱)

"لو مرزا تفتہ ایک بات لطیفے کی سنو۔ کل ہرکارہ آیا تو تمہارے خط کے ساتھ ایک خط کراچی بندر سے منشی فیض احمد فیض کا بھی لایا جس میں لکھا ہے کہ ہم تمہاری صد سالہ برسی مناتے ہیں۔ جلسہ ہوگا جس میں تمہاری شاعری پر لوگ مضمون پڑھیں گے۔ بحث کریں گے۔ تمہاری زندگی پر کتابیں چھپیں گی۔ ایک مشاعرہ بھی کرنے کا ارادہ ہے۔ تم بھی آؤ اور خرچہ آمد و رفت کا پاؤ۔ دن کی روٹی اور رات کی شراب بھی ملے گی۔ بہت خیال دوڑایا سمجھ میں نہ آیا کہ یہ صاحب کون ہیں۔ ان سے کب اور کہاں ملاقات ہوئی تھی۔ اگر شاعر ہیں تو کس کے شاگرد ہیں۔ بارے منشی ہیرا سنگھ آئے اور دریافت ہوا کہ ادھر لاہور اور ملتان کی عملداری میں ان کا نام مشہور ہے۔ متوطن سیالکوٹ کے ہیں کہ لاہور سے آگے ایک بستی ہے جہاں کھیلوں کا سامان اور شاعر اچھے بنتے ہیں۔ ایسے کہ نہ صرف ملک کے اندر ان کی مانگ ہے بلکہ دساور کو بھی بھیجے جاتے ہیں۔ ان میاں فیض کے متعلق بھی منشی ہیرا سنگھ نے بتایا کہ اکثر یہاں سے دساور بھیجے جاتے ہیں۔ وہاں سے واپس کئے جاتے ہیں لیکن یہ پھر بھیجے جاتے ہیں۔ ادھر جو ماورائے قفقاز روس کی سلطنت ہے وہاں کا والی ان کی بہت قدر کرتا ہے۔ اپنے ہاں بلاتا ہے خلعت دیتا ہے اور پچھلے دنوں ان کی شاعری سے خوش ہو کر تمغہ اور

انعام صد ہزاری بھی بخشتا ہے کہ یہین انعام کہلاتا ہے اور کسی کسی کو ملتا ہے۔ یہ قصیدہ اچھا ہی کتنے ہوں گے۔ لیکن اپنی اپنی قسمت کی بات ہے۔ دلی کا قلعہ آباد تھا تو بادشاہ کا قصیدہ اور جوان بخت کا سہرا ہم نے بھی لکھا تھا۔ غفران مآب نواب رامپور کی مدح میں بھی اکثر اشعار لکھے اور ملکہ وکٹوریہ کا قصیدہ کہہ کر بھی لیفٹننٹ گورنر کے توسط سے گزارانا۔ لیکن کبھی اتنی یافت نہ ہوئی کہ ساہوکار کا قرضہ چکتا کرتے۔ اتنی سرکاریں دیکھیں آمدنی اب بھی وہی ایک سو باسٹھ روپے آٹھ آنے۔ فتوح کا اعتبار نہیں آئے آئے نہ آئے نہ آئے۔ منشی ہیرا سنگھ نے یہ بھی بتایا کہ یہ فیض احمد فیض انگریزی دان ہیں پھر بھی آدمی نیک اور نستہ ذوق کے ہیں۔ کسی مدرسے میں لڑکے پڑھاتے ہیں۔ لڑکے پڑھانے والوں کے متعلق میری رائے اچھی نہیں۔ وہ مرد مجہول منشی امین الدین قاطع قاطع والا بھی تو ہٹیالے میں راجہ کے مدرسے میں مدرس تھا۔ لیکن خیر یہ آدمی اچھے ہی ہوں گے۔ خط تو بڑی محبت اور ارادت کا لکھا ہے۔ شروع خط میں چھاپے کے حرفوں میں ادارہ یادگار غالب بھی مرسوم ہے۔

اچھا ایک بات کل کے خط میں لکھنا بھول گیا تھا۔ منشی شیو نرائن سے کہو کہ دیوان کا چھاپا روک دیں کہ ایک سوداگر کتابوں کا بلاد پنجاب سے آیا ہوا ہے۔ شیو نرائن سے ہماری شرط تھی کہ وہ چھاپے تو پچاس نسخے احباب میں تقسیم کرنے اور صاحبانِ عالیشان کی نذر گزارنے کے لئے بایں تہی دستی دبے زری اس سے قیمتاً لیں گے تاکہ اس پر بار نہ پڑے لیکن یہ شخص اس شرط پر چھاپنے کو آمادہ ہے کہ ہمیں کچھ نہیں دینا پڑے گا۔ بلکہ وہ پانچ نسخے حق تصنیف میں ہم کو دے گا۔ جب کہ شیو نرائن اور دوسرے مطبع والے ایک نسخہ دیتے تھے۔ بہت اخلاق کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ آتے ہوئے دو شیشے شراب انگریزی کے بھی لایا تھا۔ میں نے وعدہ کر لیا ہے۔

ہاں تو وہ صدی والی بات رہی جاتی ہے۔ اسی سے دیکھ لو کہ عناصر میں اعتدال کی کیا حالت ہے۔ سوچتا ہوں، جاؤں کہ نہ جاؤں؟ منڈی بھیج دیتے تو کوئی بات بھی تھی۔ بعد میں یہ لوگ کرایہ آمد و رفت بھی دیں یا نہ دیں۔ نہیں بابا نہیں جانا۔ میں نہیں جاتا

نجات کا طالب

غالب

(۲)

سعادت و اقبال نشاں مرزا علاؤالدین خاں بہادر کو فقیر اسد اللہ کی دعا پہنچے۔ لو صاحب یہ تمہارا پوتا، فرخ مرزا کا بیٹا مرزا جمیل الدین عالی انعام اور جاگیریں بانٹنے لگا۔ یہ حال اکمل الاخبار سے کھلا۔ تم نے تو نہ بتایا۔ لوہارو سے میرا اشرف علی آئے تو یہ بھی پتہ چلا کہ یہ عزیز لوہارو چھوڑ ادھر کہیں سندھ میں جا نوکر ہوا۔ پہلے یہ کار عالی کی بیٹھی میں تھا۔ اب کسی ساہوکار سے کے کارخانے میں منصرم ہے۔ اتنی دور کیوں جانے دیا۔ ڈوابوں اور رئیسوں کے لڑکے سیٹھوں ساہوکاروں کے منصدی ہوتے۔ ہاں صاحب شاہی لد گئی تو کچھ بھی نہ رہا۔ عالی شاید تخلص ہے۔ شعر کتنا ہو گا۔ اللہ ترقی دے۔ کس سے اصلاح لیتا ہے؟

ہاں تو وہ انعام جاگیر والی بات۔ اکمل الاخبار والے مضمون میں تھا کہ سال بھر میں جو دیوان یا قصے کہانیاں وغیرہ از قسم داستان امیر حمزہ چھپتے ہیں۔ اسی عزیز کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ یہ ان کو جانچتا ہے اور جو کلام یا تصنیف پسندیدہ ٹھہرے اس پر انعام دیتا ہے۔ کسی کو پانچ ہزار، کسی کو دس ہزار، کسی کو کم بھی۔ ہزار دو ہزار بھی۔ یہ جو میرا اردو کا کلام کانپور میں چھپا ہوا ہے۔ مطبع والے نے بامید انعام بھجوایا تھا۔ وہ تو مصر تھا کہ اس کے ساتھ ایک قصیدہ بھی خوشخط لکھوا کر طلائی جدول کے ساتھ بھیجا جائے۔ لیکن میں نے اسے ضروری نہ جانا۔ کہ تعلقات میرے تم لوگوں سے عزیزداری

کے کسی سے مخفی نہیں۔ میں تو اس کے بعد ہنڈوی کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اُلٹا مطبع والوں کے نام لفافہ آیا کہ یہ فارم بھر کے بھیجو۔ چھ جلدیں داخل کرو اور پھر مصنفوں کی کمیٹی کے فیصلے کا انتظار کرو۔ یہ بھی لکھا تھا کہ مرزا جمیل الدین عالی فقط انعام کی رقوم کا امانتدار ہے۔ فیصلے کا کچھ اور صاحبان علم کی رائے پر انحصار ہے۔ مطبع والے نے ان لوگوں کے نام دریافت کئے۔ اس کا بھی کوئی جواب نہ آیا۔ اب اکمل الاخبار کہتا ہے کہ ایک انعام سراج الدین ظفر کو ملا۔ میں سمجھا شاہ نے رنگون میں کلام چھپوا کر بھیجا ہوگا۔ لیکن بات جی لگتی نہیں تھی کہ وہ سرکار تو انعام دینے والی تھی۔ اب وضاحت ہوئی کہ یہ اور صاحب ان کے ہمنام ہیں لیکن شاعر اچھے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی تھا کہ ایک اور صاحب نے انعام پایا لیکن ناخوش ہو کر لوٹا دیا کہ مجھے ضرورت نہیں۔ اللہ اللہ کیسے مستغنی لوگ ہیں۔ پورے ایک ہزار کا انعام تھا۔

صاحب میں دوبارہ لکھتا ہوں کہ اب وہ زمانہ نہیں کہ ادھر متھرا داس سے قرض لیا۔ ادھر درباری مل کو مارا۔ ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی۔ ہر ایک کے پاس تمسک مہری موجود۔ شہد لگاؤ۔ چاٹو۔ پھر کبھی خان نے کچھ دے دیا۔ کبھی الور سے کچھ دلا دیا۔ میرا مختار کار بنیا سود ماہ بماہ چاہے۔ گویا سود جُدا۔ مول جُدا ۔۔۔ چوکیدار جدا۔ بی بی جُدا۔ بچے جُدا۔ شاگرد پیشہ جُدا۔ آمد وہی کہ تھی۔ اب کے جو یہ بنیا پنشن کے مجتمعہ دو ہزار لایا۔ اس نے اپنے پاس رکھ لئے کہ پہلے میرا حساب کیجئے۔ سات کم پندرہ سو روپے اس کے ہوتے۔ قرض متفرق گیارہ سو روپے پندرہ اور گیارہ چھبیس سو روپے۔ یعنی دو ہزار مل کر بھی چھ سو روپے گھاٹا۔ یہ جو ایک ہزار روپے ان شاعر مستغنی الاحوال نے اپنے مقام سے فروتر پا کر لوٹا دیئے ہیں۔ غالب غریب کو مل جاتے تو کم از کم اب تک کا قرض صاف ہو جاتا۔ شاعری سے بس یہی تو یافت تھی کہ قصیدہ لکھا، انعام پایا۔ اب وہ سرکاریں نہ رہیں۔ کتاب چھپواؤ تو مطبع والا مشکل

سے راضی ہونا ہے۔ کہتا ہے اتنی جلدیں خرید و۔ اپنے دوستوں کے پاس بھجواؤ۔ تب ہاتھ لگاتا ہوں۔ یہ تصانیف پر انعام و اکرام والا قصہ بنا ہے۔ اگر تم اس عزیز کو دو حرف لکھ دو تو بڑی بات ہو۔ اس بات کا میں برا نہیں مانتا کہ کلام ان کو یا اُن کی کمیٹی کو پسند نہیں آیا۔ مروت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ کسی اور سے نہ کہتا۔ تم سے واجب جان کر کہہ دیا کہ اتنا خیال کرتے ہو۔ محبت کا دم بھرتے ہو۔

راقم
غالب

(۳)

"اہا ہا ہا۔ میرا پیارا میر مہدی آیا۔ غزلوں کا پشتارہ لایا آرے میاں بیٹھو۔ شعر و شاعری کا کیا ذکر ہے۔ یہاں تو مکان کی فکر ہے۔ یہ مکان چار روپے مہینے کا ہر چند کہ ڈھب کا نہ تھا۔ لیکن اچھا تھا۔ شریفوں کا محلہ ہے۔ پہلے مالک نے بیچ دیا۔ نیا مالک اسے خالی کرانا چاہتا ہے۔ مدد لگا دی ہے۔ پاڑ باندھ دی ہے۔ اسی دو گز چوڑے صحن میں رات کو سوتا ہوں۔ پاڑ کیا ہے۔ پھانسی کی ٹکٹکی نظر آتی ہے۔ منشی حبیب اللہ ذکا نے ایک کوٹھی کا پتہ دیا تھا جو شہر سے باہر ہے۔ سوار ہوا۔ گیا۔ مکان تو پُر فضا تھا۔ احاطہ بھی۔ چمن اور گل بوٹے بھی۔ لیکن حویلی اور محل سرا الگ الگ نہ تھے۔ ڈیوڑھی بھی نہ تھی۔ بس ایک پھاٹک تھا۔ کمرے اور کوٹھڑیاں خاصی۔ کمروں کے ساتھ کوٹھڑیوں میں چینی مٹی کے چولھے سے بھی بنے تھے۔ معلوم ہوا بیت الخلاء ہیں۔ صاحبان انگریز ان پر چڑھ کر بیٹھتے ہیں۔ ایک زنجیر کھینچتے ہی پانی کا تریڑا آتا ہے۔ سب کچھ بہا لے جاتا ہے۔ عجیب کارخانہ ہے۔ میں نے کرایہ پوچھا اور جھٹ کہا پانچ روپے منظور۔ ایک روپیہ زائد کی کچھ ایسی بات نہیں۔ لیکن مالک مکان کا کارندہ ہنسا اور بولا۔ پانچ روپے نہیں مرزا صاحب! پانچ سو روپے۔ میں نے کہا۔ خریدنا منظور نہیں۔ کرائے پر لینا ہے۔ وہ مردک سر ہلا کر کہنے لگا۔ پانچ سو روپے کرایہ ہے اور دو سال کا پیشگی چاہیئے۔

یعنی بارہ ہزار دو اور آن اُنر و۔ یہاں جتنی قبر کے پاس دھنا سیٹھ نے حویلی ڈھا کر اونچا اُونچا ایک مکان بنایا ہے۔ دو۔ دو تین تین کمرے کے حصّے ہیں۔ کلیان کو بھیجا تھا خبر لایا کہ وہ پگڑی مانگتے ہیں۔ میں حیران ہوا۔ تمہیں معلوم ہے۔ میں پگڑی عمامہ کچھ نہیں باندھتا۔ ٹوپی ہے ورنہ ننگے سر۔ لوہارو والوں کے ہاں سے جو پگڑی پار سال ملی تھی۔ وہ نکلوا کے بھجوادی کہ دیکھ لیں اور اطمینان کرلیں کہ مکان ایک مردِ معزز کو مطلوب ہے وہ اُلٹے پاؤں آیا کہ یہ دستار نہیں چاہیئے رقم مانگتے ہیں دس ہزار۔ کرایہ اس کے علاوہ ساٹھ روپے مہینا۔ بڑے بد معاملہ لوگ ہیں۔ آخر پگڑی پھر صندوق میں رکھوادی۔ یہ مالک مکان کل آتا ہے۔ دیکھیے کیا کہتا ہے۔

میرن صاحب آئیں۔ شوق سے آئیں لیکن یہ گانے بجانے والوں میں نوکری کا خیال ہمیں پسند نہیں۔ میں نے دیکھا نہیں لیکن معلوم ہوا ہے کہ ایک کوٹھی میں مشینیں لگا کر اس کے سامنے لوگ گاتے ناچتے ہیں۔ شعر پڑھتے ہیں۔ تقریریں کرتے ہیں۔ لوگ، اپنے گھروں میں ایک ڈبا سامنے رکھ کر سن لیتے ہیں بلکہ اب تو اور ترقی ہوتی ہے ایک نیا ڈبہ انگریز کاریگروں نے نکالا ہے۔ اس میں ایک گھنڈی ہے اسے مروڑنے پر سننے کے علاوہ ان اربابِ نشاط کی شکلیں بھی گھر بیٹھے دیکھ سکتے ہیں۔ ایک خط ان میں سے ایک جگہ سے میرے پاس بھی آیا تھا۔ آدمی تو یہیں کے ہیں۔ لیکن انگریزی میں لکھتے ہیں بہت دنوں رکھا رہا۔ آخر ایک انگریزی خواں سے پڑھوایا۔ مشاعرے کا دعوت نامہ تھا۔ کچھ حق الخدمت کا بھی ذکر تھا۔ میں تو گیا نہیں۔ دوبارہ انہوں نے یاد کیا نہیں۔ چونکہ پیسے دیتے ہیں۔ سرکاروں درباروں کی جگہ ان لوگوں نے لے لی ہے جس کو چاہتے ہیں نوازتے ہیں۔ میرن صاحب مجھے جان سے عزیز لیکن ان لوگوں سے سفارش کیا کہہ کر کروں کہ سیّد زادہ ہے؟ اُردو فارسی کا ذوق رکھتا ہے؟ اسے نوکر رکھو۔ اچھا رکھ بھی لیا تو کاپی نویسوں میں رکھیں گے۔ میر مہدی یہ وہ زمانہ نہیں۔ اب تو انگریزی کی پوچھ ہے

یا پھر سفارش چاہیئے۔

خط لکھ لیا اب محل سرا میں جاؤں گا۔ ایک روٹی شوربے کے ساتھ کھاؤں گا۔ شہر کا عجب حال ہے۔ باہر نکلنا محال ہے۔ ابھی ہرکارہ آیا تھا۔ خبر لایا کہ ہڑتال ہو رہی ہے۔ ہاٹ بازار سب بند۔ لڑکے جلوس نکال رہے ہیں۔ نعرے لگا رہے ہیں۔ کبھی کبھی لڑکوں اور برقندازوں میں جھڑپ بھی ہو جاتی ہے۔ میر مہدی معلوم نہیں اس شہر میں کیا ہونے والا ہے۔ میرن کو وہیں روک لو۔ میر سرفراز حسین اور میر نصیر الدین کو دعا۔

نجات کا طالب

غالب

(۴)

منشی صاحب میاں داد خاں سیاح یہ خط نواب میر غلام بابا خاں کے توسط سے بھیج رہا ہوں کہ تمہارا تحقیق نہیں اس وقت کہاں ہو اشرف الاخبار تمہارے نام بھجوایا تھا وہ واپس آ گیا کہ مکتوب الیہ شہر میں موجود نہیں۔ اس اخبار کے مہتمم صاحب کل آئے تو کچھ اخبار بلادِ دیگر کے دے گئے کہ مرزا صاحب انہیں پڑھیے اور ہو سکے تو رنگ ان لوگوں کی تحریر کا اختیار کیجیے کہ آج کل اسی کی مانگ ہے یہ اخبار لاہور اور کراچی بندر کے ہیں۔ کچھ سمجھ میں آتے کچھ نہیں آتے۔ آدھے آدھے صفحے تو تصویروں کے ہیں۔ دو دو رنگ کی چھپائی، موٹی موٹی سرخیاں۔ افرنگ کی خبریں۔ اگر بہت جلدی بھی آئیں تو مہینہ سوا مہینہ تو لگتا ہی ہے لیکن یہ لوگ ظاہر کرتے ہیں، کہ آج واردات ہوئی اور آج ہی اطلاع مل گئی۔ گویا لوگوں کو پر جاتے ہیں۔ بے پر کی اڑاتے ہیں۔ پھر ایک ہی اخبار میں کشیدہ کاری کے نمونے ہیں ہنڈیا بھوننے کے نسخے ہیں کھیل تماشوں کے اشتہار ہیں۔ ایک لمبا چوڑا مضمون دیکھا۔

" اداکارہ دیبا کے چلغوزے کس نے چرائے " سارا پڑھ گیا یہ سمجھ میں نہ آیا کہ

کیا بات ہوئی۔ کسی کی جیب سے کسی نے چلغوزے نکال لئے۔ تو یہ کون سی خبر ہے خیر یہ سب سہی۔ لطیفے کی بات اب کہتا ہوں۔ کراچی کے ایک اخبار میں میرے تین خط چھپے ہیں۔ ایک منشی ہرگوپال تفتہ کے نام ہے ایک میں نواب علائی سے تخاطب اور ایک میر مہدی مجروح کے نام۔ میں حیران کہ ان لوگوں نے میرے خطوط اخبار والوں کو کیوں بھیجے۔ اب پڑھتا ہوں تو مضمون بھی اجنبی لگتا ہے۔ اب کے جو شراب انگریزی سوداگر دے گیا ہے کچھ تیز ہے۔ اور یہ سچ ہے کہ کبھی کبھی کیفیت اک گونہ بے خودی سے آگے کی ہو جاتی ہے۔ یا تو میں نے اس عالم میں لکھے اور کلیان اٹھا کر ڈاک میں ڈال آیا۔ یا پھر کسی نے میری طرف سے گھڑے ہیں اور انداز تحریر اڑانے کی کوشش کی ہے۔ کونے میں کسی کا نام بھی لکھا ہے۔ "ابن انشا"۔ کچھ عجب نہیں یہی صاحب اس شرارت کے بانی مبانی ہوں۔ نام سے عرب معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ کیا حرکت ہے۔ سراسر دخل در معقولات ہے۔ اخبار نویسی میں ٹھٹول کیا معنی؟ بھئی مجھے بات پسند نہیں آئی۔

اُمید ہے وہ ٹوپیاں تم نے نواب صاحب کو پہنچا دی ہوں گی۔ نواب صاحب سے میرا بہت بہت سلام اور اشتیاق کہنا۔ میں سادات کا نیاز مند اور علی کا غلام ہوں۔

نجات کا طالب
غالبؔ

ناول مینوفیکچرنگ کمپنی لمیٹڈ

پاکستان نے ناول مینوفیکچرنگ کمپنی لمیٹڈ ہونہار مصنفین اور دیگر تازہ ناشرین کے لیے اپنی خدمات پیش کرنے کا مسرت سے اعلان کرتی ہے۔ کارخانہ ہذا میں ناول جدید ترین آٹومیٹک مشینوں پر تیار کیے جاتے ہیں اور تیاری کے دوران انہیں ہاتھ سے نہیں چھوا جاتا۔ ناول اسلامی ہو یا جاسوسی۔ تاریخی یا رومانی۔ مال عمدہ اور خالص لگایا جاتا ہے اس لیے یہ ناول مضبوط اور پائیدار ہوتے ہیں۔ پڑھنے کے علاوہ بھی یہ کئی کام آتے ہیں۔ بچہ رو رہا ہو، ضد کر رہا ہو۔ دو ضربوں میں راہ راست پر آجائے گا۔ بلی نے دودھ میں یا کتے نے نعمت خانہ میں منہ ڈال دیا ہو۔ دور ہی سے تاک کے مار دیجیے۔ پھر ادھر کا رُخ نہیں کرے گا۔ بیٹھنے کی چوکی اور گھڑے کی گھڑونچی کے طور پر استعمال ہونے کے علاوہ یہ چوروں ڈاکوؤں کے مقابلے میں ڈھال کا کام بھی دیتا ہے۔ ایک تو اس لیے کہ اس کے مطالعے سے دل میں شجاعت کے جذبات خواہ مخواہ موجزن ہو جاتے ہیں۔ دوسرے اپنی ضخامت اور پٹھے کی نوکیلی جلد کے باعث — خواتین کے لیے ہمارے ہاں واش اینڈ ویئر (WASH & WEAR) ناول بھی موجود ہیں تاکہ ہیروئن کا نام بدل کر پلاٹ کو بار بار استعمال کیا جا سکے۔ ایک ہی پلاٹ برسوں چلتا ہے۔ پندرہ بیس ناولوں کے لیے کافی رہتا ہے۔

واش اینڈ ویئر کوالٹی ہمارے اسلامی تاریخی ناولوں میں بھی دستیاب ہے۔ آؤٹ

کے ساتھ اس امر سے مطلع کرنا ضروری ہے کہ کون سی قسم مطلوب ہے۔ ۶۵ بز رومان اور ۳۵ بز تاریخ والی یا ۶۵ بز تاریخ اور ۳۵ بز رومان والی۔ اجزائے ترکیبی عام طور پر حسب ذیل ہوں گے۔

۱۔ ہیروئن۔ کافر دوشیزہ۔ تیر تفنگ، بنوٹ پٹے اور بھیس بدلنے کی ماہر۔ دل ایمان کی روشنی سے منور۔ چھپ چھپ کر نماز پڑھنے والی۔

۲۔ کافر بادشاہ۔ ہماری ہیروئن کا باپ لیکن نہایت تنفی القلب۔ انجام اس کا بُرا ہوگا۔

۳۔ لشکر کفار۔ جس کے سارے جرنیل لحیم شحیم اور بزدل۔

۴۔ اہل اسلام کا لشکر۔ جس کا ہر سپاہی سوالاکھ پر بھاری۔ نیکی اور خدا پرستی کا پتلا۔ پابندِ صوم وصلوٰۃ۔ قبول صورت بلکہ چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑانے والا۔

۵۔ ہیرو۔ لشکر متذکرہ صدر کا سردار۔ اس حسن کی کیا تعریف کریں کچھ کہتے ہوتے جی ڈرتا ہے۔

۶۔ سبز پوش خواجہ خضر۔ جہاں پلاٹ رک جاتے اور کچھ سمجھ میں نہ آتے۔ وہاں مشکل کشائی کرنے والا۔

۷۔ ہیرو کا جاں نثار ساتھی۔ نوجوان اور کنوارا تاکہ اس کی شادی بعد ازاں ہیروئن کی وفادار اور محرم راز خادمہ یا سہیلی سے ہو سکے۔

۸۔ کافر بادشاہ کا یک چشم وزیر جو شہزادی سے اپنے بیٹے کی، بلکہ ممکن ہو تو اپنی شادی رچانے پر ادھار کھاتے بیٹھا ہے۔ چونکہ ادھار محبت کی قینچی ہے۔ لہٰذا ہیروئن کے التفات سے محروم رہتا ہے۔

پلاٹ تو ہمارے ہاں کئی طرح کے ہیں لیکن ایک اسٹینڈرڈ ماڈل جو عام طور پر مقبول ہے یہ ہے کہ ایک قبیلے کا نوجوان دوسرے قبیلے کی دوشیزہ پر فدا ہوتا ہے اور

ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ دوشیزہ لامحالہ طور پر دوسرے قبیلے کے سردار کی چہیتی بیٹی ہوتی ہے۔ پانچوں انگلیاں پانچوں چراغ۔ خوبصورت، سلیقہ مند، عالم بے بدل۔ لاکھوں اشعار زبانی یاد۔ کرنا خدا کا کیا ہوتا ہے۔ اسی بیچ میں دونوں قبیلوں میں لڑائی ٹھن جاتی ہے۔ ہمارا ہیرو محبت کو فرض پر قربان کرکے شمشیر اٹھا لیتا ہے اور بہادری کے جوہر دکھاتا کشتوں کے پشتے لگاتا دشمن کی قید میں چلا جاتا ہے۔ محافظوں کی آنکھ میں دھول جھونک کر طالب و مطلوب ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ اشعار اور مکالموں کا تبادلہ ہوتا ہے اور ہیروئن بھی پہلے ایک جان سے پھر ہزار جان سے اس پر عاشق ہو جاتی ہے۔ راستے میں ظالم سماج کئی بار آتا ہے لیکن ہر دفعہ منہ کی کھاتا ہے۔ دانت پیستا رہ جاتا ہے۔ آخر میں ناول حق کی فتح، محبت کی جیت۔ نعرۂ تکبیر۔ شرعی نکاح، دونوں قبیلوں کے ملاپ اور مصنف کی طرف سے دعائے خیر کے ساتھ آیندہ ناول کی خوشخبری پر ختم ہوتا ہے۔

آرڈر دیتے وقت مصنف یا ناشر کو بتانا ہوگا کہ ناول پانچ سو صفحے کا چاہیے؟ ہزار صفحے کا یا پندرہ سو کا؟ وزن کا حساب بھی ہے۔ دو سیری ناول۔ پانچ سیری ناول۔ سات سیری ناول۔ پندرہ بیس سیری بھی خاص آرڈر پر مل سکتے ہیں۔ گاہک کو یہ بھی بتانا ہوگا۔ کہ اسی پلاٹ کو برقرار رکھتے ہوئے ماحول کس ملک کا رکھا جائے۔ عراق کا؟ عرب کا؟ ایران کا؟ افغانستان کا؟ ہیرو اور ہیروئن کے نام بھی گاہک کی مرضی کے مطابق رکھے جاتے ہیں۔ ایک پلاٹ پر تین یا اس سے زیادہ ناول لینے پر ۳۳ فی صد رعایت تھا۔

خواتین کے لئے بھی جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ گھریلو اور غیر گھریلو ہر طرح کے ناول بکفایت ہمارے ہاں سے مل سکتے ہیں۔ ان میں بھی محبت اور خانہ داری کا تناسب ۵۰ فی صد اور ۵۰ فی صد کا ہوتا ہے۔ فرمائش پر گھٹایا یا بڑھایا بھی جا سکتا

ہے۔ خانہ داری سے مطلب ہے ناول کے کرداروں کے کپڑوں کا ذکر۔ خاندانی حویلی کا نقشہ۔ بیاہ شادی کی رسموں کا احوال۔ زیورات کی تفصیلات وغیرہ۔ ہیرو اور ہیروئن کے چچازاد بھائی بہنیں۔ سہیلیاں اور رقیب وغیرہ بھی مطلوبہ تعداد میں ناول میں ڈلوائے جا سکتے ہیں۔ ہمارے کارخانے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ خواتین کے ناول مروجہ پاکستانی فلموں کو دیکھ کر لکھے جاتے ہیں تاکہ بعد ازاں فلمساز حضرات ان پر مزید فلمیں بنا سکیں۔ معمولی سی مزید اجرت پر ان ناولوں میں گانے اور دو گانے وغیرہ بھی ڈالے جا سکتے ہیں۔ اس سے مصنف اور فلمساز کا کام اور آسان ہو جاتا ہے۔ گاہک کو فقط ہیروئن کا نام تجویز کر دینا چاہیئے۔ باقی سارا کام ہمارے ذمے۔ مال کی گھر پر ڈیلیوری کا انتظام ہے۔

بازار کے ناول بالعموم ایسے گنجان لکھے اور چھپے ہوتے ہیں کہ پڑھنے والوں کی آنکھوں پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ صفحے میں کم سے کم لفظ رہیں۔ مکالمے اور مکالمہ بولنے والے، دونوں کے لئے الگ الگ سطر استعمال کی جاتی ہے۔ نمونہ ملاحظہ فرمایئے۔

شہزادی سبز پری نے کہا:

"پیارے گلفام"

پیارے گلفام نے کہا:

"ہاں شہزادی گلفام۔ ارشاد"

شہزادی سبز پری:

"ایک بات کہوں؟"

گلفام:

"ہاں ہاں کہو"

شہزادی :-

"مجھے تم سے پیار ہے"

گلفام :-

"سچ ؟"

شہزادی صاحبہ :-

"ہاں سچ"

گلفام :-

"تو پھر شکریہ"

شہزادی نے کہا :-

"پیارے گلفام - اس میں تشکریہ کی کیا بات ہے - یہ تو میرا انسانی فرض تھا"

ایک ضروری اعلان - ہمارے کارخانے نے ایک عمدہ آئی لوشن بھی تیار کیا ہے جو رقت پیدا کرنے والے ناولوں کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے جہاں ایسا سین آتے رونے کے بعد دو دو قطرے ڈراپر سے آنکھوں میں ڈال لیجئے - آنکھیں دھل جائیں گی - نظر تیز ہو جائے گی - مسلسل استعمال سے عینک کی عادت بھی چھوٹ جاتی ہے - فی شیشی دو روپے - تین شیشیوں پر محصول ڈاک معاف - آنکھیں پونچھنے کے لئے عمدہ رومال اور دوپٹے بھی ہمارے ہاں سے دستیاب ہیں -

مکمل باورچی خانہ جدید

(ایک ریویو)

جناب مطبخ مراد آبادی کی یہ کتاب مستطاب ہمارے پاس بغرض ریویو آئی ہے۔ جو صاحب یہ کتاب لائے وہ نمونہ طعام کے طور پر بگھارے بینگنوں کی ایک پتیلی بھی چھوڑ گئے تھے۔ کتاب بھی اچھی نکلی۔ بینگن بھی۔ قلت گنجائش کی وجہ سے آج ہم فقط کتاب پر ریویو دے رہے ہیں۔ بینگنوں پر پھر کبھی سہی۔ اس سلسلے میں ہم اپنے کرمفرماؤں کو ریویو کی یہ شرط یاد دلانا چاہتے ہیں کہ کتاب کی دو جلدیں آنی ضروری ہیں۔ اور سالن کی دو پتیلیاں۔

اس کتاب میں بہت سی باتیں اور ترکیبیں ایسی ہیں کہ ہر گھر میں معلوم رہنی چاہئیں مثلاً یہ کہ سالن میں نمک زیادہ ہو جائے تو کیا کیا جائے۔ ایک ترکیب تو اس کتاب کے بموجب یہ ہے کہ اس سالن کو پھینک کر دوبارہ نئے سرے سے سالن پکایا جائے۔ دوسری یہ کہ کوئلے ڈال دیجئے۔ چولہے میں نہیں سالن میں۔ بعد ازاں نکال کر کھائیے۔ یہاں تھوڑا سا ابہام ہے۔ یہ وضاحت سے لکھنا چاہیئے تھا کہ کوئلے نکال کر سالن کھایا جائے یا سالن نکال کر کوئلے نوش جان کئے جائیں ہمارے خیال میں دونوں صورتیں آزمائی جا سکتی ہیں۔ اور پھر جو صورت پسند ہو اختیار کی جا سکتی ہے۔

کھیر پکانے کی ترکیب بھی شامل کتاب ہذا ہے۔ اس کے لئے ایک چرخے۔ ایک کتے۔ ایک ڈھول اور ایک ماچس کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ نسخہ امیر خسرو کے زمانے سے اگرچہ چلا آتا ہے۔ لیکن اس میں ماچس کا ذکر نہ ہوتا تھا۔ خدا جانے چرخے کو کیسے

جلاتے ہوں گے۔ ٹیڑھی کھیر عام کھیر ہی کی طرح ہوتی ہے۔ فقط اس میں بگلا ڈالنا ہوتا ہے۔ تاکہ حلق میں پھنس سکے۔ اس کتاب میں بعض ترکیبیں ہمیں آسانی کی وجہ سے پسند آئیں۔ مثلاً بادام کا حلوہ یوں بنایا جا سکتا ہے کہ حلوہ لیجئے۔ اور اس میں بادام چھیل کر ملا دیجئے۔ بادام کا حلوہ تیار ہے۔ بینگن کا اچار ڈالنے کی ترکیب یہ لکھی ہے کہ بینگن لیجئے۔ اور بطریقہ معروف اچار ڈال لیجئے۔

چند اور اقتباسات ملاحظہ ہوں :

آلو چھیلنے کی ترکیب

سامان :- آلو - چھری - پلیٹ ' ناول ، ڈیٹول ، پٹی -

آلو لیجئے - اسے چھری سے چھیلیے - جن صاحبوں کو گھاس چھیلنے کا تجربہ ہے ان کے لئے یہ کچھ مشکل نہیں - چھلے ہوئے آلو ایک الگ پلیٹ میں رکھتے جائیے - بعض صورتوں میں جہاں چھیلنے والا ناخواندہ ہو - یہ عمل بالعموم یہیں ختم ہو جاتا ہے - لیکن ہماری اکثر قارئین پڑھی لکھی ہیں لہٰذا آلو چھیلنے میں جاسوسی ناول یا فلمی پرچے ضرور پڑھتی ہوں گی - ڈیٹول انہی کے لئے ہے - جہاں چرکا لگا ڈیٹول میں انگلی ڈبوئی اور پٹی باندھ لی - ہمارے تجربے کے مطابق ڈیٹول کی ایک چھوٹی شیشی میں آدھ سیر آلو چھیلے جا سکتے ہیں - بعض جزرس اور سلیقہ مند خواتین سیر بھر بھی چھیل لیتی ہیں - جن بہنوں کو ڈیٹول پسند نہ ہو وہ ٹنکچر یا ایسی ہی کوئی اور دوا استعمال کر سکتی ہیں - نتیجہ یکساں رہے گا -

حلوہ بے دودھ

اس حلوے کی ترکیب نہایت آسان ہے - حلوہ پکائیے - اور اس میں دودھ لیتے - نہایت مزیدار حلوہ بے دودھ تیار ہے - ورق لگائیے اور مجھے سے کھائیے -

نہاری

کون ہے جس کے مُنہ میں نہاری کا لفظ سُن کر پانی نہ بھر آئے۔ اس کا رواج دِلّی اور لاہور میں زیادہ ہے۔ لیکن دونوں جگہ نسخے میں تھوڑا اختلاف ہے۔ دِلّی والے نلیاں۔ پائے۔ مغز اور بارہ مسالے ڈالتے ہیں۔ جس سے زبان فصیح اور بامحاورہ ہو جاتی ہے۔ پنجاب والے بھوسی۔ بنولے اور چنے ڈالتے ہیں کہ طب میں مقوی چیزیں مانی گئی ہیں۔ گھوڑے اول الذکر نسخے کو چنداں پسند نہیں کرتے۔ جس میں کچھ دخل صوبائی تعصب کا بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اس تعصب سے دِلّی والے بھی یکسر خالی نہیں۔ ان کے سامنے دوسرے نسخے کی نہاری رکھی جائے تو رغبت کا اظہار نہیں کرتے، بلکہ بعض تو بُرا بھی مان جاتے ہیں

اس بات میں فقط ایک احتیاط لازم ہے۔ کھانے والے سے پوچھ لینا چاہیے کہ وہ آدمی ہے یا گھوڑا۔

لائق مصنف نے سنبوسہ بیسن، کریلوں کی کھیر اور تھالی کے بینگن وغیرہ تیار کرنے اور انڈا اُبالنے وغیرہ کی ترکیبیں بھی دی ہیں۔ لیکن ہم نے خود مکمل باورچی خانہ کی صرف ایک ترکیب آزمائی ہے۔ وہ ہے روٹی پکانے کی۔ قارئین کرام بھی اسے آزمائیں اور لطف اُٹھائیں۔

سب سے پہلے آٹا لیجیے۔ آٹا آگیا؟۔ اب اس میں پانی ڈالیے۔ اب اسے گوندھیے۔ گندھ گیا؟ شاباش۔ اب چولھے کے پاس اکڑوں بیٹھیے۔ بیٹھ گئے؟ خوب۔ اب پیڑا بنائیے۔ جس کی جسامت اس پر موقوف ہے کہ آپ لکھنؤ کے رہنے والے ہیں یا بنّوں کے۔ اب کسی ترکیب سے اسے چپٹا اور گول کر کے توے پر ڈال دیجیے اسی کا نام روٹی ہے۔ اگر یہ کچی رہ جائے تو ٹھیک ورنہ کوئلوں پر ڈال دیجیے تا آنکہ جل جائے۔ اب اسے اُٹھا کر رومال سے ڈھک کر ایک طرف رکھ دیجیے اور نوکر کے ذریعے

تنور سے پکی پکائی دو روٹیاں منگا کر سالن کے ساتھ کھایئے بڑی مزیدار معلوم ہوں گی۔

مصنف نے دیباچے میں اپنے خاندانی حالات بھی دیئے ہیں۔ اور شجرہ بھی منسلک کیا ہے۔ ان کا تعلق مُلّا دو پیازہ کے گھرانے سے ہے۔ شاعر بھی ہیں۔ بیاہ شادیوں پر ان کی خدمات حاصل کی سکتی ہیں۔ دیگیں پکانے کے لئے بھی۔ سہرا کہنے کیلئے بھی۔ ہر ترکیب کے بعد مصنف نے اپنے اشعار بھی درج کئے ہیں۔ جس سے دونوں خصوصیتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ باورچی خانہ کا باورچی خانہ، دیوان کا دیوان۔

"ہماری کمرشیل سروس" (۱)

خواتین وحضرات آج ہم قارئین کی پُرزور فرمائش پر اپنے کالم کی کمرشیل سروس کا آغاز کر رہے ہیں۔ ایک زمانے میں اخبار اور ریڈیو بھی ہمارے کالم کی طرح خشک بلکہ گرم خشک ہوتے تھے۔ بارے اشتہاروں کا زمانہ آیا اور ان میں کچھ رنگینی پیدا ہوئی۔ ریڈیو پر شروع شروع میں تو تقریروں، ڈراموں، فیچروں، گانوں اور خبروں کے درمیان کبھی کبھی اشتہار آتے تھے۔ اب اشتہاروں کے درمیان جہاں جگہ خالی رہ جاتے۔ڈرامے، فیچر یا خبریں اس طرح دی جاتی ہیں جس طرح ہمارے اخباروں میں اداریے کے نیچے یا کہیں اور خالی جگہ رہ جاتے تو کاتب خود ہی لکھ دیتا ہے "اخبار ہذا میں اشتہار دینا کلید کامیابی ہے"۔ یا زیادہ با ذوق ہوا تو خودی کو بلند کر دیتا ہے یا تقدیر امم بتا دیتا ہے ٹیلیویژن سلمہ نے تو خیر یہ رمز پہلے ہی سمجھ لی تھی کہ لوگ اشتہار سننے کے لئے ٹیلیویژن خریدتے ہیں، باقی پروگرام تو خانہ پُری کے ہیں واقعی ہم بھی سوچتے ہیں کہ ٹیلیویژن رہنمائی نہ کرتا تو لوگ کس سے پوچھ کر بناسپتی گھی۔ صابن اور بستر کی چادریں خریدتے، جس ٹیس کا منہ تکا کرتے یا بغیر صابن ۵۰۰ سے کپڑے دھوتے اور بغیر نارنگی وناسپتی میں پکا وٹامن سے بھرپور کھانا کھاتے کھری چارپائی پر لوٹ لگایا کرتے۔

تلوار مارکہ جوتے

ہماری فیکٹری کے عمدہ اور آرام دہ جوتے۔ شہر بھر میں مقبول۔ پہننے میں بھی اچھے چٹخانے میں بھی خوب۔ اس وقت ہمارے شہر میں جو ہزاروں لوگ جوتے چٹخاتے پھر رہے ہیں۔ ان میں زیادہ تر ہماری دکان کے گاہک ہیں، یہ جوتے بے روزگاروں کے لئے خاص طور پر موزوں ہیں۔

ہمارے "تلوار مارکہ جوتوں کی سیاسی جماعتوں میں بڑی مانگ ہے۔ کراچی کی ایک سیاسی جماعت کے صدر فرماتے ہیں۔ کہ ہم نے گزشتہ الیکشن کے دنوں میں یہی جوتے استعمال کئے تھے۔ ہمارے "تمام امیدواروں میں انہی جوتوں میں دال بٹی تھی۔ ایک اور سیاسی جماعت کے سیکرٹری صاحب بھی ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ گزشتہ دنوں اس پارٹی کے دو گروہوں کے درمیان جو جوتا چلا تھا۔ وہ ہماری ہی فیکٹری کا بنا ہوا تھا۔

پسوؤں اور کھٹملوں کے لئے بھی "تلوار مارکہ جوتوں سے بہتر کوئی شے کارگر نہیں۔ کھٹمل یا پسو کو زمین پر رکھیے اور جوتوں سے مسل دیجئے۔ ہمارے جوتے کا مسلا پانی نہیں مانگتا۔ لہذا یہ ان بستیوں میں بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ جن میں پانی کی کمی ہے۔

ہمارے جوتے جہیز میں دینے کے لئے خاص طور پر پسند کئے جاتے ہیں۔ جن بی بیوں کے پاس ہوں وہ میاں تو کیا شے ہے پورے سسرال کو جوتے کی نوک پر رکھتی ہیں۔

چام کے دام بڑھنے کے باوجود ہماری قیمتیں بازار کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ خاص آرڈر پر ہم پاپوش میں آفتاب کی کرن بھی لگا کر دیتے ہیں اور اس

کے علیحدہ پیسے چارج نہیں کرتے۔

نوٹ :۔ نیا اسٹاک آ گیا ہے اور اب ہم اپنے تمام مہربان سرپرستوں کی خدمت کرنے کے قابل ہیں۔ یقین رکھیئے کہ جو گاہک بھی ہماری دکان پر آئے گا ہم اس کو جوتا دیں گے۔!

ملیریا سے نجات حاصل کیجئے

ملیریا سے نجات کے لئے کلن قوال اینڈ پارٹی ریڈیو سنگر فلا رنس روڈ کی خدمات حاصل کیجئے۔

ملیریا مچھروں سے پھیلتا ہے۔ بعض لوگ ان موذیوں سے نجات پانے کے لئے ناگوار بُو والے تیل اور کوائل وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے قدیم زمانے سے یہ مقصد قوالی کے ذریعہ حاصل کیا جاتا رہا ہے۔ عارفانہ کلام روح کی تازگی اور بالیدگی ہی کا تیر بہدف نسخہ نہیں بلکہ ملیریا کا بھی دشمن ہے۔ ہمارے قوال اور تالی بجانے والے دیکھتے دیکھتے مچھروں کے لاشوں کا ڈھیر لگا دیتے ہیں۔ جن علاقوں میں ایک بار ہماری پارٹی کی خدمت حاصل کی گئیں وہاں کے لوگ نہ صرف نیک۔ خدا ترس اور صوفی ہو گئے۔ بلکہ موسمی بخار کا بھی کھٹکا نہ رہا۔

مختلف میونسپل کمیٹیوں کے ہیلتھ افسروں کے سرٹیفکیٹ موجود ہیں۔

نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

نیند تو صحت کے لئے نہایت ضروری چیز ہے لیکن یاد رکھیئے خواب آور

گولیوں کا استعمال خطرے سے خالی نہیں۔ اس لئے سمجھدار لوگ ادیب۔ شاعر۔ تاجر پیشہ۔ عشق پیشہ حضرات نیند لانے کے لئے ہمارے ہاں کی حسب ذیل مطبوعات استعمال کرتے ہیں۔

جدلیاتی لسانیات کے اساسی اصول، ۱۲۰ صفحہ قیمت چار روپے۔

تنقید کے مابعد الطبیعاتی نظریات ۲۱۶ صفحے قیمت چھ روپے۔ فیملی سائز مطلوب ہو تو حضرت خوگوش لکھنوی کا "تازہ ترین ناول "خواب خرگوش" استعمال کیجئے۔ ۴۲۵ صفحات پر محیط اس لافانی تحفے کی قیمت فقط اٹھارہ روپے ہے۔ محصول ڈاک معاف۔ خوراک بڑوں کے لئے چار سے آٹھ صفحے، بچوں کے لئے دو صفحے۔ تین سال سے کم عمر کے بچوں کو فقط کتاب کی شکل دکھا دینا کافی ہے۔ مقررہ خوراک سے زیادہ استعمال نہ کیجئے۔ خراٹے آنے کا ڈر ہے۔

چند غیر ضروری اعلانات

بس مسافروں کے لئے مژدہ

کراچی بس مالک ایسوسی ایشن بڑے فخر اور مسرت سے اعلان کرتی ہے آج سے شہر میں تمام بسوں کے کرائے دُگنے کر دیئے گئے ہیں۔ اُمید ہے سب وطن حلقوں میں اس فیصلے کا عام طور پر خیر مقدم کیا جائے گا۔ کیونکہ اس سے بس مالکان کی آمدنی پر ہی نہیں، مسافروں کے معیارِ زندگی پر بھی خوشگوار اثر پڑے گا۔

ایسوسی ایشن ہذا، کرایوں میں اضافے کے علاوہ مسافروں کے لئے کچھ اور سہولتوں کا بھی اعلان کرتی ہے۔ مثلاً ہر بس میں جہاں فقط چالیس سواریوں کی گنجائش ہوتی تھی۔ اب اس سے تین گنا مسافروں کو جگہ دی جایا کرے گی۔ اس مقصد سے ہر بس کی چھت میں کنڈوں اور تسموں کا اضافہ کر دیا گیا ہے اور سیٹیں نکال دی گئی ہیں جو خواہ مخواہ کھڑے ہونے والوں کے گھٹنوں سے ٹکراتی تھیں۔

پبلک کی مزید آسانی کے لئے ہر بس کی چھت پر، پائیدانوں پر، مڈگارڈوں پر انجن پر حتی کہ سائلنسر تک پر مسافروں کے بیٹھنے اور کھڑے ہونے کی گنجائش نکالی گئی ہے ان مخصوص جگہوں کا کرایہ بھی کچھ زائد نہیں ہو گا۔ شرح ٹکٹ وہی رہے گی جو اندر بیٹھنے یعنی کھڑے ہونے اور لٹکنے والے مسافروں سے وصول کی جاتی ہے گی۔ آئندہ سے سب

مسافروں کے حقوق بھی مساوی ہوں گے۔ یعنی ہر مسافر کو بس کو دھکا لگانے کا یکساں حق ہوگا حتیٰ کہ آدھا ٹکٹ لینے والے بچوں اور بغیر ٹکٹ سفر کرنے والے معذوروں کو بھی۔ بسوں میں یتیم خانوں کے لئے چندہ اکٹھا کرنے والوں اور کھٹی میٹھی گولیاں بیچنے والوں کو بھی یہ حق دینے پر اس میٹنگ میں غور کیا جارہا ہے۔ جو کراچی کا ٹرانسپورٹ کا مسئلہ حل کرنے کے لئے کمشنر صاحب کے دفتر میں اگلے ہفتے ہو رہی ہے۔

۲۔ پانی بند رہے گا

ناظم آباد اور نارتھ ناظم آباد کے باشندوں کو مژدہ ہو کہ جمعے اور ہفتے کو ان کے گھروں کا پانی بند رہا کرے گا۔ یہ سہولت روزانہ تیئیس گھنٹے پانی بند رہنے کی سہولت کے علاوہ ہے۔ بعض مجبوریوں کی وجہ سے فی الحال ہفتے میں دو دن سے زیادہ پانی مکمل طور پر بند رکھنا ممکن نہیں۔ ناغے کے دنوں کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھائی جائے گی۔ اُمید کی جاتی ہے کہ ماہِ محرم کی آمد تک ہم ہفتے کے ساتوں دن پانی بند رکھنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اس کے ساتھ ساتھ بلدیہ کراچی اور کے ڈی اے نہایت مسرت سے اعلان کرتی ہیں کہ اہل ناظم آباد کے ایک دیرینہ مطالبے کو تسلیم کرتے ہوئے اس علاقے کے واٹر ٹیکس میں فوری طور پر تین سو فیصدی اضافہ کیا جارہا ہے آگے چل کر اس میں اور بھی اضافہ کرنے کی کوشش کی جائے گی لیکن کے ڈی اے اور بلدیہ کے روز افزوں وسائل اور محدود اخراجات کو دیکھتے ہوئے فی الحال اس کی قطعی طور پر ضمانت نہیں دی جاسکتی۔

علامہ اقبال ٹاؤن نارتھ ناظم آباد کے پارک میں کامیاب تجربے کے بعد شہر کے دوسرے پارکوں کا پانی بھی بند کیا جارہا ہے تاکہ زمین بھر بھری ہو جائے اور کتے آسانی سے اس میں لوٹ لگا سکیں۔

۳۔ آپ کا اپنا اسکول

انٹرنیشنل انگلش آکسفورڈ اسکول آپ کا اپنا اسکول ہے جو تعلیم کے جدید ترین

کولوں پر کھولا گیا ہے۔ چند خصوصیات۔

۱۔ فیس کا معیار نہایت اعلیٰ۔ شہر کا کوئی اور اسکول فیس کے معاملے میں ہمارے سکولوں کا مقابلہ نہیں کرتا۔ انواع واقسام کے چندے اس کے علاوہ ہیں۔ جن کی تفصیل پرنسپل صاحب کے دفتر سے معلوم کی جاسکتی ہے۔

۲۔ اساتذہ۔ نہایت محنتی، ایماندار اور قناعت پسند جن کو پیش قرار تنخواہوں پر رکھا گیا ہے۔ عام ٹیچر کی تنخواہ بھی ہمارے ہاں میونسپل کارپوریشن کے جمعدار سے کم نہیں اور پرنسپل کا مشاہرہ تو کسی بڑی سے بڑی غیر ملکی کمپنی کے چوکیدار کی تنخواہ سے بھی زیادہ ہے۔

۳۔ چھٹیاں، چھٹیوں کے معاملے میں بھی ہمارا اسکول دوسرے تمام اسکولوں پر فوقیت رکھتا ہے ہر ماہ فیس جمع کرنے کے دن کے علاوہ قریب قریب پورا سال چھٹی رہتی ہے۔ جو والدین سال بھر کی فیس اکٹھی جمع کرا دیں۔ ان کے بچوں کو فیس کے دن بھی حاضری دینے کی ضرورت نہیں۔

۴۔ ماحول۔ اسکول نہایت مرکزی اور پر رونق جگہ پر واقع ہے اور شہر کا سب سے قدیمی اوپن ایئر اسکول ہے۔ یہاں طلباء کو مناظر فطرت سے محبت کرنا سکھایا جاتا ہے بالکل سامنے ایک سینما ہے اور ایک سرکس۔ ایک بغل میں موٹر گیراج ہے۔ اور دوسری طرف گڑھ باغیچہ جس کی کھاد سارے شہر کو ہرا بھرا رکھنے کی ضامن ہے۔ پروفیسر کیوی کے اصول کے مطابق یہاں پڑھائی کتابوں سے نہیں کرائی جاتی۔ بلکہ کسی اور طرح بھی نہیں کرائی جاتی تاکہ طالب علم کے ذہن پر ناروا بوجھ نہ پڑے۔

۵۔ نتیجہ۔ اسکول کا نتیجہ کم از کم سو فیصد رہتا ہے کئی بار تو دو سو ڈھائی فیصد بھی ہو جاتا ہے کوئی شخص خواہ وہ طالب علم ہو یا غیر طالب علم۔ اس اسکول کے پاس سے بھی گزر جائے تو پاس ہوتے بنا نہیں رہ سکتا۔ طالب علموں پر امتحان میں بیٹھنے کی کوئی پابندی نہیں۔ سب کو گھر بیٹھے کامیابی کی سندیں بھیج دی جاتی ہیں۔

اشتہارات ضرورت نہیں ہے کے

ایک بزرگ اپنے نوکر کو فہمائش کر رہے تھے کہ تم بالکل گھامڑ ہو۔ دیکھو میر صاحب کا نوکر ہے اتنا دور اندیش کہ میر صاحب نے بازار سے بجلی کا بلب منگایا تو اس کے ساتھ ہی ایک بوتل مٹی کے تیل کی اور دو موم بتیاں بھی لے آیا کہ بلب فیوز ہو جائے تو لالٹین سے کام چل سکتا ہے۔ اس کی چمنی ٹوٹ جائے یا بتی ختم ہو جائے تو موم بتی روشن کی جا سکتی ہے۔ تم کو ٹیکسی لینے بھیجا تھا تم آدھے گھنٹے بعد ہاتھ لٹکاتے آ گئے۔ کہا کہ جی ٹیکسی تو ملتی نہیں۔ موٹر رکشہ کہتے تو لیتا آؤں۔ میر صاحب کا نوکر ہوتا تو موٹر رکشہ لے کے آیا ہوتا تاکہ دوبارہ جانے کی ضرورت پڑتی۔

نوکر بہت شرمندہ ہوا اور آقا کی بات پلے باندھ لی۔ چند دن بعد اتفاق سے آقا پر بخار کا حملہ ہوا تو انہوں نے اسے حکیم صاحب کو لانے کے لئے بھیجا۔ تھوڑی دیر میں حکیم صاحب تشریف لائے۔ تو ان کے پیچھے پیچھے تین آدمی اور تھے جو سلام کر کے ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ ایک کی بغل میں کپڑے کا تھان تھا۔ دوسرے کے ہاتھ میں لوٹا۔ اور تیسرے کے کاندھے پر پھاوڑا۔ آقا نے نوکر سے کہا۔ یہ کون لوگ ہیں میاں نوکر نے تعارف کرایا کہ جناب ویسے تو حکیم صاحب بہت حاذق ہیں۔ لیکن اللہ کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے۔ خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو میں درزی کو لے آیا ہوں اور وہ کفن کا کپڑا ساتھ لایا ہے۔ یہ دوسرے صاحب غسال ہیں

اور تیسرے گورکن۔ ایک ساتھ اس نتے سے آیا کہ بار بار بھاگنا نہ پڑے۔

ایسے ہی ایک بزرگ ہمارے حلقہ احباب میں بھی ہیں۔ گلی سے ریڑھی والا ہانک لگاتا گزر رہا تھا کہ انگور ہیں چمن کے۔ پپیتے ہیں پیڑ کے پکے ہوتے۔ انہوں نے لڑکا بھیج کر اسے بلایا اور کہا، میاں جی معاف کیجئے۔ ہمیں ضرورت نہیں ہے۔ پھل والا چلا گیا تو ہم نے عرض کیا کہ اس زحمت کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تو جا ہی رہا تھا اسے روکنا کیا ضرور تھا۔ بولے۔ احتیاط کا تقاضا تھا کہ اس پر بات واضح کر دی جائے اور معذرت بھی کی جائے کیونکہ بے چارا اتنی دور سے اتنی اُمید سے کر پھل بیچنے آتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اسے یہ گمان نہ گزرے کہ اس گھر میں شاید بہرے رہتے ہیں جو اس کی آواز نہیں سن پاتے۔ یہی ہمارے دوست ایک روز کار میں ہمارے ساتھ گولی مار سے گزر رہے تھے۔ ایک جگہ لکھا ہے تشریف لائیے۔ ربڑی قلفی اور لسی تیار ہے۔ انہوں نے فوراً کار ٹھہرائی اور دوکاندار سے کہا کہ پہلی بات تو یہ کہ ہمارے پاس فرصت نہیں۔ ہم ضروری کام سے جا رہے ہیں۔ دوسرے قلفی اور ربڑی ہم نہیں کھاتے اور لسی کا بھلا یہ کون سا موسم ہے؟۔ بہرحال تمہاری پیش کش کا شکریہ۔ وہ تو بیٹھا لسنا گیا اور نہ جانے کیا سمجھا گیا۔ کار میں واپس بیٹھے ہوتے ہمارے دوست نے وضاحت کی کہ یہاں کے لوگ ان آداب کو کیا جانیں۔ یہاں تو دعوت نامہ آتا ہے اور اس کے نیچے RSVP لکھا ہوتا ہے کہ جواب سے مطلع فرمایئے۔ جن کو شریک نہیں ہونا ہوتا وہ بھی چپ بیٹھ رہتے ہیں۔ میزبان کو مطلع کرنا ضروری نہیں سمجھتے کہ بندہ حاضر ہونے سے معذور ہے اس بچارے کا کھانا ضائع جاتا ہے۔

ہم نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ ہم خود انہی آداب سے بے بہرہ لوگوں میں سے ہیں۔ لوگ اخباروں میں طرح طرح کے اشتہارات چھپواتے ہیں کہ ہم پڑھ کر ان کی طرف

متوجہ ہوں لیکن ہم انہیں پڑھ کر ایک طرف ڈال دیتے ہیں۔ کوئی ہمارے لئے ٹھیکے کا بندوبست کرتا ہے اور ٹینڈر نوٹس شائع کرتا ہے کسی کو ہمارے ہاتھ پلاٹ یا مکان بیچنا ہوتا ہے۔ کوئی ہمیں یہ اطلاع دیتا ہے کہ اس نے اپنے نالائق فرزند کو جائداد سے عاق کر دیا ہے۔ کہیں کسی کی کوشش ہوتی ہے کہ ہم ان کی فرزندی قبول کریں۔ اور ذات پات تعلیم اور تنخواہ کی شرطیں من وعن وہی رکھی جاتی ہیں۔ جو ہم میں ہیں۔ کوئی ہمیں گھر بیٹھے لاکھوں روپے کمانے کا لالچ دیتا ہے کوئی شارٹ ہینڈ سکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ بہت سے کالج مشتاق ہیں۔ کہ ہم ان کے ہاں داخلہ لیں اور بعضے اپنی کاریں اور ریفریجریٹر معقول قیمت پر ہماری نذر کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان سب ضرورت مندوں سے آدمی کیسے عہدہ برآ ہو۔ بہت سوچنے کے بعد یہ ترکیب ہماری سمجھ میں آئی ہے کہ جہاں ہم ضرورت ہے کا اشتہار چھپوادیں ہماری دانست میں ان اشتہارات کی صورت کچھ اس قسم کی ہونی چاہیئے۔

کرائے کے لئے خالی نہیں ہے

۰۰۰ہم گز پر تین بیڈ روم کا ایک ہوادار بنگلہ نما مکان، جس میں نلکا ہے اور عین دروازے کے آگے کارپوریشن کا کوڑا ڈالنے کا ڈرم بھی۔ کرایے پر دینا مقصود نہیں ہے۔ نہ اس کا کرایہ تین سو روپے ماہوار ہے اور نہ چھ ماہ پیشگی کرایہ کی شرط ہے جن صاحبوں کو کرایے کے مکان کی ضرورت ہو وہ فون نمبر 34567 پر رجوع نہ کریں۔ کیوں کہ اس کا کچھ فائدہ نہیں۔

اطلاع عام

راقم محمد دین ولد فتح دین کریانہ مرچنٹ یہ اطلاع دینا ضروری سمجھتا ہے کہ اس

کا فرزند رحمت اللہ نہ نافرمان ہے نہ اوباشوں کی صحبت میں رہتا ہے لہٰذا اسے جائداد سے عاق کرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ آئندہ جو صاحب اسے کوئی ادھار وغیرہ دیں گے۔ وہ میری ذمہ داری پر دیں گے۔

ضرورت نہیں ہے

کار مارس مائنر ماڈل ۱۹۵۹ء بہترین کنڈیشن میں۔ ایک بے آواز ریڈیو نہایت خوبصورت کیبنٹ، ایک ویسپا موٹر سائیکل اور دیگر گھریلو سامان پنکھے پلنگ وغیرہ قسطوں پر یا بغیر قسطوں کے ہمیں درکار نہیں۔ ہمارے ہاں خدا کے فضل سے یہ سب چیزیں پہلے سے موجود ہیں۔ اوقات ملاقات ۳ تا ۸ بجے شام

عدم ضرورت رشتہ

ایک پنجابی نوجوان برسرِ روزگار آمدنی تقریباً پندرہ سو روپے ماہوار کے لئے کسی باسلیقہ، خوبصورت شریف خاندان کی تعلیم یافتہ دوشیزہ کے رشتے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ لڑکا پہلے سے شادی شدہ ہے۔ خط و کتابت صیغہ راز میں نہیں رہے گی۔ اس کے علاوہ بھی بے شمار لڑکے اور لڑکیوں کے لئے رشتے مطلوب نہیں ہیں۔ پوسٹ بکس نمبر کراچی۔

داخلے جاری نہ رکھئے

کراچی کے اکثر کالج آج کل انٹر اور ڈگری کلاسوں میں داخلے کے لئے اخباروں میں دھڑا دھڑ اشتہار دے رہے ہیں۔ یہ سب اپنا وقت اور پیسہ ضائع کر رہے ہیں۔ ہمیں ان کے ہاں داخل ہونا مقصود نہیں۔ ہم نے کئی سال پہلے ایم اے پاس کر لیا تھا۔

ہم مہمان خصوصی بنے

آج کل کراچی کے کالجوں اور اسکولوں میں مباحثوں اور یوموں کا موسم ہے سکہ بند مہمان خصوصی کو دن میں دو دو درس گاہیں بھگتانی پڑ رہی ہیں۔ صبح کہیں ہے شام کہیں۔ ہمارے ایک بزرگ تو مدرسہ رشیدیہ حنفیہ میں ایلورا اور اجنتا کی تصویروں پر اظہار خیال کر آئے کیونکہ اپنے ساتھ غلطی سے شام والی تقریر لیے گئے تھے۔ اس کی تلافی کے لئے اس شام انہیں ماڈرن آرٹ کالج میں حضرت ابوہریرہؓ کی زندگی اور حدیثوں میں اسمائے رجال کی اہمیت پر بولنا پڑا۔ اس شہر میں چالیس پچاس کالج ہوں گے اور سیکنڈری اسکول بھی بہت ہیں۔ لیکن سب ہمارے دیکھتے دیکھتے لوگوں میں تقسیم ہو گئے۔ ہم بالکل ہی مایوس ہو گئے تھے کہ ایک اسکول والوں کا فون آیا کہ کل ہمارے ہاں جلسہ ہے مہمانِ خصوصی آپ ہوں گے۔

"کس قسم کا اسکول ہے آپ کا" ہم نے پوچھا۔

جواب ملا کہ پرائمری اسکول ہے۔

ہم نے کہا۔ جب اس شہر میں اتنے سارے پرائمری پاس مہمانانِ خصوصی موجود ہیں تو ہمارا صدارت کرنا کچھ عجیب سا معلوم ہو گا۔ ہم یوں بھی درویش گوشہ نشین آدمی ہیں انکسار ہماری طبیعت میں داخل ہے۔ کسی اور کو......

لیکن ہمارا یہ عذر مسموع نہ ہوا۔

ہم نے بھی اس سے زیادہ عذر اور انکار مناسب نہ جانا جتنا کہ کسی مہمان خصوصی پر اخلاقاً واجب ہے۔ تاکہ کسی اور کو نہ بلالیں۔ لہذا ہتھیار ڈال کر کہا۔ اچھا صاحب۔ آپ لوگ مجبور کرتے ہیں تو حاضر ہو جائیں گے کیونکہ قومی خدمت اور تعلیم کے فروغ کا معاملہ ہے ورنہ من آنم کہ من دانم۔

ہم کوئی عادی قسم کے مہمان خصوصی نہیں ہیں۔ ہر کوئی ممتاز حسن ہو بھی نہیں سکتا کہ بحرِ معنی کا شناور ہو۔ جدھر چاہے بے تکلف تیرتا نکل جائے۔ ممتاز صاحب میں مروت اس قدر ہے کہ کسی سے انکار نہیں کرتے۔ ان کا سیکرٹری اپنی ڈائری میں نوٹ کرتا جاتا ہے کہ کس روز کس وقت جلسہ ہے۔ اور وقت کے وقت یاد دلاتا ہے۔ بعض اوقات تو یہ بات بھی نوٹ ہونے سے رہ جاتی ہے کہ جلسہ کس کی طرف سے ہے اور کس تقریب میں ہے۔ ممتاز حسن صاحب جب موقع پر پہنچتے ہیں۔ تب پتہ چلتا ہے کہ انہیں فارابی کے فلسفے کے بارے میں بولنا ہے یا چیمبر آف کامرس کے ممبروں سے مشرقِ وسطیٰ کو کھالوں کی برآمد کے امکانات پر گفت گو کرنی ہے۔ خیام سوسائٹی کی سالگرہ کے سالانہ جلسے کی انہیں پیشگی اطلاع نہ تھی۔ انہیں جلسہ گاہ میں پہنچ کر معلوم ہوا تاہم وہ تین گھنٹے تک اس موضوع پر بولتے رہے کہ خیام کے جو ترجمے جاپانی اور آرمینی زبانوں میں ہوتے ہیں، ان میں کیا کیا لغزشیں ہوتی ہیں۔ اسی سلسلے میں انہوں نے نظام الملک طوسی، باترن، کالیداس اور بلھے شاہ کے ہم معنی اشعار بھی سنائے۔ شام کو انہیں ریڈیو پر فن پہلوانی کی تاریخ اور رموز کے موضوع پر لیکچر دینا پڑا اور اسی رات کو ٹی وی پر راگ جے جے ونتی کا موازنہ بتھوون کی چودھویں سمفنی اور پنجابی کے مقبول گیت "موڑیں بابا ڈانگ والیا" سے کیا۔ اگلے روز ہومیو پیتھوں

کے سالانہ جلسے کا افتتاح بھی انہوں نے کیا اور صدارتی خطبہ ارشاد فرمایا ۔ بعد میں ہومیو پیتھی کالج کے پرنسپل نے ہمیں بتایا کہ ممتاز صاحب نے آرنیکا اور فاریبکا کے جو خواص بتائے ہیں اور ان دواؤں کا رشتہ جوارش جالینوس اور سدھ مکردھوج سے ثابت کیا ہے ، وہ ہمارے لئے بالکل نئی معلومات ہیں ۔ یہی رائے ہم نے ڈائریکٹر محکمہ زراعت سے سُنی جنہیں ممتاز صاحب نے اپنے تجربات کی روشنی میں بتایا کہ شکر قندی کی فصل کے لئے کون سی کھاد زیادہ مفید رہتی ہے اور قدیم بابل میں میکسی پاک گندم کی کاشت کس طرح کی جاتی تھی ۔

ہاں ہم ایسوں کو کچھ نہ کچھ پیشگی تیاری کی ضرورت پڑتی ہے ۔ لہٰذا جہاں ہم نے قمیص کو کلف لگوایا ۔ جوتا پالش کیا ۔ سوٹ استری کرایا ۔ وہیں ایک تقریر بھی سوچ لی کہ تعلیمی کاموں کے لئے ہم گلے گلے حاضر ہیں اور پرائمری تعلیم سے ہمیں بڑا ہی دلچسپی ہے بلکہ ایک زمانے میں تو پرائمری کلاسوں کے طالب علم بھی رہ چکے ہیں ۔ اور یہ کہ آج کل کے بچوں کو ہماری تقلید کرنی چاہیئے یعنی خدمت قوم کا جذبہ اپنے میں پیدا کرنا چاہیئے اور ایثار سیکھنا چاہیئے اور اچھی اچھی باتیں کرنی چاہئیں اور بُری بُری باتیں چھوڑ دینی چاہئیں ۔ تاکہ ہمارا پیارا پاکستان ترقی کرے وغیرہ ۔ اتفاق سے ہمیں اپنی اس تقریر کا مسودہ مل گیا جو ہم نے پارسال ہاکرز کنونشن میں کی تھی ۔ اور ذرا سی ترمیم کرکے لائبریری ایسوسی ایشن کے جلسے میں بھی استعمال کر چکے تھے یہ اس موقع کے لئے بھی برمحل نظر آئی کیونکہ قومی خدمت اور تہذیبِ اخلاق وغیرہ کوئی ہاکروں اور لائبریرین حضرات کا اجارہ تھوڑا ہی ہیں ۔ یہ بات طالب علموں میں بھی پیدا ہو جائے تو ہرج کی بات نہیں ۔

مطالعے کی وسعت اور علم کی گہرائی بڑی اچھی چیزیں ہیں لیکن ایک قباحت

کا پہلو بھی ان میں ہے۔ ہماری ہی مثال لیجئے۔ اتنے بہت سارے خیالات اور نکات ایک ساتھ ہمارے ذہن میں ہجوم کر آتے ہیں کہ ان کے گچھے سے بن جاتے ہیں اور حلق میں اٹک جاتے ہیں۔ ادب، فلسفہ۔ طبّ، تاریخ۔ جغرافیہ کسی کو نظر انداز کرنے کو جی نہیں چاہتا اور پھر وہ تمام اشعار بھی موقع بہ موقع استعمال کرنے ہوتے ہیں جو ایک سلپ پر لکھے ہماری جیب میں رہتے ہیں۔ ہمارے پاس فالتو وقت ہو تو ان کو چھانٹ کر قرینے سے ترتیب بھی دیں۔ لیکن جلسے کرنے والوں کو عموماً جلدی ہوتی ہے۔ دریوں اور تمبوؤں والے تیار کھڑے ہوتے ہیں کہ کب جلسہ ختم ہو کب سامان ریڑھے پر لادیں۔ ادھر چائے ٹھنڈی ہو رہی ہوتی ہے۔ اور بعض لوگ جن کو اپنے اعصاب پر قابو نہیں ہوتا۔ اپنی جماہیوں کو بھی مزید نہیں روک پاتے۔ سو اس آپا دھاپی کے عالم میں ہم باتیں تو ساری کہہ گزرتے ہیں اور شعر بھی قریب قریب سارے استعمال کر لیتے ہیں لیکن اتنی بن میکھ ممکن نہیں ہوتی کہ مختلف مسائل کا آپس میں جوڑ ملائیں یا اشعار اور موضوع کا ربط دیکھیں۔ سامعین میں سے سمجھنے والے خود ہی اندازہ کر لیتے ہیں کہ کون سا شعر دراصل کون سے مضمون سے متعلق سمجھنا چاہیئے اور جو مسائل بیان کیے گئے ہیں ان کی اصل ترتیب کیا ہے۔ لیکن سبھی لوگ تو ایسے نکتہ شناس نہیں ہوتے۔ سطحی مذاق کے سامعین اگر ہماری تقریر کو بے ربط اور الجھی ہوئی خیال کریں تو ہمارے نزدیک قابل معافی ہیں۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔

اگر معاملہ کالج یا یونیورسٹی کا ہوتا تو ہم بہت سے مباحث چھوڑ جاتے۔ یہ فرض کر لیتے کہ ان عزیز طالب علموں کو یہ باتیں پہلے سے معلوم ہیں۔ لیکن پرائمری کے بچوں کو ہر چیز قدرے تفصیل سے سمجھانی چاہیئے اور یہی ہم نے کیا۔ کون نہیں جانتا کہ آج کل ہمارا سب سے بڑا مسئلہ افراطِ زر ہے اور زرِ مبادلہ کی کمی ہے۔ ہمیں اپنی برآمدی تجارت

کو بڑھانا چاہیئے۔ قدرتناسب سے پہلے ہم نے موزوں الفاظ میں اس مسئلے کا ذکر کیا اور کسی شاعر کے اس شعر پر بات ختم کی۔

اقبال تیرے عشق نے سب بل دیئے نکال
مدت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

امابعد جنوبی افریقہ کی سیاست اور قبرص کے قضیے اور موسیقی کے باب میں حضرت امیر خسرو کی خدمات اور ابن رشد کے فلسفے اور سیم تھور کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ اسی میں ہمارے سفر یورپ کے کچھ تاثرات بھی آ گئے۔ اور خلفائے راشدہ کے عہد کی تعریف بھی۔ ایسی تقریریں بالعموم خشک ہوتی ہیں۔ لہذا ہم ساتھ ساتھ پانی بھی پیتے گئے اور یہ شعر پڑھ کر جو اس وقت یاد نہیں کس کا ہے' ان مسائل کو بھی سمیٹا۔

میراں نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی تھی

یہاں سے گریز کر کے ہم ان مسائل ضروری کی طرف آئے جن کا ذکر اوپر کیا ہے۔ خدمت خلق، راستبازی، ایثار کی ضرورت وغیرہ۔ ہم اور بھی بولتے اگر سیکرٹری صاحب چٹ نہ بھیج دیتے کہ آج کی حد تک یہی کافی ہے۔ اب آپ تھک گئے ہوں گے۔ آخر ہم خدائے سخن، لسان العصر، فردوسی اسلام، استاد ذوق رحمتہ اللہ علیہ کے اس مصرع پر بات ختم کر کے بیٹھ گئے۔

جو ہو ذوق یقیں پیدا
تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

اس تقریر پر بہت سی تالیاں پٹیں۔ اکثر تو ہمیں بے موقع بھی معلوم ہوئیں۔ کچھ طالب علموں نے منہ میں انگلیاں دے کر سیٹیاں بھی بجائیں۔ جیسی سینماؤں میں معیاری

اور سنجیدہ فلموں پر اظہارِ پسندیدگی کے لئے بجائی جاتی ہیں۔ بعضوں نے بنچ بجائے اور فرش پر پاؤں سے مسلسل تھاپ دی۔ لیکن ہمارے نزدیک اس میں ہماری کچھ خوبی نہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ قبولِ سخن خداداد چیز ہے۔

ہم نے اپنی تقریر میں جو زور راستبازی کی خوبیوں پر دیا تھا۔ اس کا اثر تو فوراً ظاہر ہوا۔ سیکرٹری صاحب نے آخر میں شکریے کی تقریر کی تو اس میں حاضرین کو بتایا کہ اصل میں صدارت کے لیے ہم نے ڈپٹی کمشنر صاحب کو بلایا تھا چنانچہ اعلان اور دعوت ناموں میں اُنہی کا نام ہے لیکن ایک دن پہلے انہوں نے انکار کر دیا۔ ہم نے کچھ اور لوگوں سے رجوع کیا ہر ایک نے کچھ نہ کچھ عذر کیا۔ آخر انشاء اللہ خاں انشآ صاحب مل گئے۔ ان کی ذات محتاجِ تعارف نہیں۔ ان کی غزلیں اسکولوں کے نصابوں میں داخل ہیں۔ کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں وغیرہ۔۔

اس موقع پر ایک صاحب لپک کر آئے اور ان کے کان میں سرگوشی کی کہ ارے انشاء اللہ خاں انشآ کو مرے تو بہت دن ہوئے۔ یہ آج کل کے ادیب ہیں۔ ابھی زندہ ہیں۔ سیکرٹری صاحب سے غلطی تو ہو گئی تھی لیکن انہوں نے کھنکار کر صورتِ حال کو بڑی خوبصورتی سے سنبھال لیا۔ فرمایا:۔ "ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ہمارے مہمانِ گرامی کی ذات ستودہ صفات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ یہ آج کل کے ادیب ہیں اور ابھی زندہ ہیں۔ انہوں نے بہت سے ناول لکھے ہیں۔ ڈرامے لکھے ہیں جو گھر گھر میں پڑھے جاتے ہیں۔ بہرحال ڈپٹی کمشنر صاحب کے نہ آنے کا ہمیں افسوس ہے۔ اور آپ کا (یہاں رک کر انہوں نے ایک صاحب سے ہمارا صحیح نام پوچھا) یعنی ابن انشآ صاحب کا ہم شکریہ ادا کرتے ہیں کہ باوجود اپنی مصروفیات کے یہاں تشریف لاتے۔ حاضرین سے ہم معذرت خواہ ہیں کہ صدارتی تقریر کی وجہ سے جلسہ ذرا طویل ہو گیا اور انہیں

سواری حاصل کرنے میں ذرا دقت ہو گی۔ بہرحال اب جلسہ ختم ہے۔ شکریہ۔ خدا حافظ۔

ایک زمانہ تھا کہ معاشرے میں شاعر ادیب کی کچھ حیثیت نہ تھی۔ بھرتے تھے میر خوار کوئی پوچھتا نہ تھا۔ غالب جیسے بھی ڈپٹی کمشنروں کی شان میں قصیدے لکھتے اور ان کے دربار میں کرسی پانے پر فخر کرتے مرگئے۔ بارے اب ان کے بھاگ کھلے اور یہ ڈپٹی کمشنروں کے نعم البدل قرار پاتے۔ پرانا زمانہ ہوتا تو ڈپٹی کمشنر کے انکار کرنے پر تحصیلدار صاحب کو تکلیف دی جاتی۔ وہ نہ ملتے تو تھانیدار صاحب مل جاتے اور بی ڈی کے چیئرمین تو کہیں گئے نہیں۔ ان سب کو نظر انداز کر کے کسی خالی خولی ادیب کو بلانا اور کرسی صدارت پر بٹھانا ایک بڑی بات ہے۔ اب بھی کوئی کہتا پھرے کہ ہمارے ہاں علم یا اہل علم کی قدر نہیں تو حیف ہے۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ جب ڈپٹی کمشنر کی جگہ شاعر ادیب استعمال ہو سکتا ہے تو اس بات کی راہ بھی کھل گئی ہے کہ ہم کسی مشاعرے میں نہ جا سکیں تو جلسے والے کسی ڈپٹی کمشنر سے غزل پڑھوا لیں۔ ہمارے لئے تو غزل وزل کہنا مشکل بھی ہے۔ ان لوگوں کے لئے مشکل بھی نہیں۔ اپنے پی اے یا کسی ماتحت افسر سے کہہ دیا کہ ڈرافٹ پیش کرو اور ہمارا تخلص ڈال دینا ہم دستخط کر دیں گے اور ہاں الفاظ مشکل نہ ہوں اور ذرا خوشخط لکھی ہوئی ہو۔"

ہم پھر مہمانِ خصوصی بنے

مومن کی پہچان یہ ہے کہ وہ ایک سوراخ سے دوبارہ نہیں ڈسا جاسکتا۔ دوسری بار ڈسے جانے کے خواہشمند کو کوئی دوسرا سوراخ ڈھونڈنا چاہیے۔ خود کو مہمان خصوصی بنتے ہم نے ایک بار دیکھا تھا۔ دوسری بار دیکھنے کی ہوس تھی۔ اب ہم ہر روز بالوں میں کنگھا کرکے اور ٹائی لگاکر بیٹھنے لگے کہ ہے کوئی اندھا محتاج جو دے سخی کو دعوت نامہ! بلاتے اسے صدارت کے لئے اپنے دوستوں سے بھی باتوں باتوں میں ہم نے بہت کہا کہ آج کل ہم خالی ہیں اور خدمت قوم کے لیے تن من دھن حاضر ہے۔ کوئی یونیورسٹی یا کالج یا اسکول ہماری ذات ستودہ صفات سے اپنے جلسے کی رونق بڑھانا چاہے تو ہم بخوشی اس کے لئے اپنی مصروفیات میں سے وقت نکالیں گے۔ بارے ایک جگہ سے دعوت نامہ آیا۔ اسپوٹنک انگلش اسکول گوبیمار کے پرنسپل صاحب نے ہم سے استدعا کی کہ آپ ہمارے ہاں مہمان خصوصی بن کر آئیں اور اسکول کو اپنی جیب خاص سے کم از کم پانچ سو روپے عطیہ دیں تو ہم بہت ممنون ہوں گے۔ ہم نے کہا۔ ہم ہیں تو بہت مصروف لیکن آپ کی خاطر آجائیں گے اور پانچ سو روپے تو خیر زیادہ ہے دو سو روپے اسکول کو دیں گے تاکہ ہمارے ملک میں تعلیم کو ترقی ہو۔ ہم ایسے نیک کاموں کی سرپرستی نہ کریں گے تو اور کون کرے گا؟ ایسا لگتا ہے کہ ان صاحبوں کو اس سے زیادہ عطیہ دینے والا کوئی اور نہ ملا لہٰذا معاملہ پٹ گیا اور ہم نے اپنی شیروانی ڈرائی کلین

ہونے کے لئے بھجوادی۔

اسپوننگ اپنی جگہ اور انگلش اپنی جگہ، لیکن نام کے اس طمطراق کے باوجود تھا یہ بھی پرائمری اسکول اور ہم یہ سوچ کر کچھ آزردہ سے ہو گئے کہ یہی رفتار رہی یعنی ہماری زندگی کے یہ دن پرائمری اسکولوں سے خطاب کرتے گذر گئے تو یونیورسٹی کنووکیشن سے خطاب کی نوبت کس عمر میں آئے گی۔ ابھی تو بہت مرحلے درمیان میں تھے۔ لوئر سیکنڈری اسکول، ہائر سیکنڈری اسکول۔ انٹر کالج۔ ڈگری کالج اور نہ جانے کیا کیا۔ خیر پچاس روپے اسکول والوں کو ایڈوانس دے کر ہم نے بات پکی کی اور کہا۔ گویہ مارتو بڑی پیچیدہ سی جگہ ہے۔ کوئی لینے آئے گا نہیں۔؟

جواب ملا کہ لینے تو کوئی نہیں آئے گا۔ آپ دو نمبر کی بس میں بالپوش نگر سے بیٹھیے اور گولی مارئیے پر اتر بیے سامنے جس گلی کی نکڑ پر آپ کو اپٹوڈیٹ ہیئر کٹنگ سیلون یعنی نفرز خفتہ کا بہترین مرکز" کا بورڈ نظر آئے اس میں سے نکل کر بائیں ہاتھ جو تھا موڑ آپ مڑیں گے تو آپ کو شامیانہ تنا ہوا ملے گا۔ لیکن ساڑھے نو بجے آپ کا پہنچ جانا ضروری ہے کیونکہ گیارہ بجے خیموں اور کرسیوں والے اپنا سامان لینے آجائیں گے۔ ہم نے کرایہ گیارہ بجے تک کا دیا ہے۔ اس کے بعد یہ چیزیں ایک شادی والے کے گھر میں جا لگیں گی۔

ہم نے کہا مضائقہ نہیں۔ ہم بھی ان کے ساتھ ساتھ شادی والے گھر چلے جائیں گے۔ آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند۔

ملا نصر الدین کو لوگوں نے دیکھا کہ ریگستان میں جا بجا کھدائی کرتے پریشان پھر رہے ہیں۔ ایک صاحب نے ماجرا پوچھا تو معلوم ہوا ایک جگہ انہوں نے کچھ روپے

داب دیے تھے۔ اور نشانی یہ رکھی تھی کہ اس وقت اُس جگہ کے عین اُوپر ابر کا ایک ٹکڑا تھا۔ جو اب کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شادیوں، بیاہوں، قوالیوں، مشاعروں، بزموں، جشنوں اور تقریری مقابلوں کی ریل پیل کے دنوں میں خیمے چھولداری کی نشانی سے کسی جگہ کو پانا کچھ ایسی ہی بات تھی لیکن خیر۔ ہم اپٹوڈیٹ ہیئر کٹنگ سیلون کی گلی میں مڑ کر بائیں ہاتھ دیکھنے لگے حتیٰ کہ دور ایک شامیانہ نظر آیا۔ وہاں جا کر دیکھا کہ دریوں پر کچھ بچے کھیل رہے ہیں۔ ایک طرف کو کرسیوں پر کچھ بزرگ بیٹھے ہیں جو ان کے والدین ہوں گے۔ لیکن ہمارے میزبان صاحبان کا کہیں پتہ نہیں۔ خیر ہم بھی ایک طرف کو بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں کچھ اور لوگ آ گئے اور اب ایک صاحب نے آ کر مودبانہ ہم سے پوچھا کہ آپ لڑکے والوں کی طرف سے ہیں نہ۔؟ باقی بارات کہاں ہے۔؟ ہم نے کہا مذاق بند کرو۔ ہمیں یہاں تقریر کر کے اور بھی کتنی جگہ صدارتیں کرنی ہیں۔ بس اب کارروائی شروع ہو۔ کہاں ہے کرسیٔ صدارت؟ ... تھوڑی سی مزید اور قدرے تکلیف دہ گفتگو کے بعد پتہ چلا کہ ہمیں اس سے اگلی گلی میں جانا چاہیے تھا۔ وہاں ہم خوب وقت پر پہنچے۔ اعلان ہو رہا تھا کہ آج کل اچھے اچھے لوگ غیر ذمہ داری برتتے ہیں۔ وعدہ کر کے تشریف نہیں لاتے۔ ہمارے آج کے مہمان بھی ایسے ہی نکلے۔ خیر اب میں بی ڈی ممبر جناب تاج الدین تاجؔ سے درخواست کرتا ہوں کہ ان کی جگہ......

لیکن ہم نے بنفس نفیس نمودار ہو کر تاج صاحب کی صدارت میں اسی طرح کھنڈت ڈال دی جس طرح ہماری فلموں میں کوئی بزرگ عین نکاح کے وقت پہنچ کر ساری کارروائی روک دیتے ہیں۔ "ٹھہرو یہ شادی نہیں ہو سکتی"۔

اس کے بعد جو کارروائی ہوئی اس میں سے ہمیں فقط اتنا یاد ہے کہ عبدالعزیز

جماعت اوّل نے ہمیں ہار پہنایا۔ دوسری جماعت کے بچوں نے انگریزی میں ہمارا خیر مقدم کیا۔ جماعت سوم کی ایک بچی نے ایک فصیح و بلیغ "تقریر پڑھی۔ جو اس کے والدین کی لیاقت، وسعتِ مطالعہ اور زبان پر غیر معمولی قدرت کا ثبوت تھی۔ اس کے بعد چوتھی جماعت کے ایک طالب علم نے "ہم مردِ مجاہد ہیں، کا ترانہ گاتے ہوتے جوش میں آکر اپنی تلوار سے ہم پر وار کیا۔ خیریت یہ ہوئی کہ ایسے موقع پر تلواریں گتے کی استعمال کی جاتی ہیں۔ زاں بعد ہم نے کھنکار کر اپنا صدارتی خطبہ شروع کیا ہی تھا۔ "خواتین و حضرات۔ اور پیارے بچو۔ . . . کہ پیچھے سے ایک صاحب نے آکے ہمارے نیچے سے کرسی کھینچ لی اور کہا۔ حضور گیارہ بج گئے۔ اب یہ سامان کہیں اور لے جانا ہے۔ ظالموں نے ہمیں حاضرینِ جلسہ کا شکریہ ادا کرنے کی بھی مہلت نہ دی۔ خیر اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ کیونکہ اس وقت حاضرین تھے کہاں۔ انہوں نے شامیانے کے کھونٹے اکھڑتے دیکھ لئے تھے اور زاں پیشتر کہ شامیانہ ان پر آن گرتا۔ غیر حاضر بن چکے تھے۔

آپ سے ملیئے

آپ سے ملیئے آپ کا اسم شریف ہے۔ حکیم محمد شریف ، ماہنامہ شرافت کے ایڈیٹر ہیں۔ پہلے امرتسر میں شریف پورہ میں رہتے تھے۔ آج کل لالو کھیت سے آگے شریف آباد میں قیام ہے۔ معجون شرافت اور شرافت منجن سے کراچی کا کون شریف آدمی واقف نہ ہوگا۔ کسی کو شرفِ ملاقات حاصل کرنا ہو تو پتہ سیدھا ہے۔ بستی میں داخل ہوتے ہی شریفے کے پیڑوں کا ایک جھنڈ نظر آئے گا۔ اسی کے ساتھ کوچہ شریفاں میں شرافت منزل سامنے نظر آئے گی۔

یہ زمانہ شرافت کا نہیں۔ چوری کہیں بھی ہو۔ سب سے پہلے پکڑ دھکڑ ہمارے حکیم صاحب ہی کی ہوتی ہے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ایک آدھ بار تلاشی ہوئی تو ان کے ٹرنکوں سے ایسا مال برآمد ہوا جس کے متعلق حکیم صاحب کو کچھ یاد نہیں کہ کب خریدا تھا۔ کہاں سے خریدا تھا۔ انہوں نے بہت کہا کہ ان ٹرنکوں کی کنجیاں ہمیشہ میرے ازاربند سے بندھی رہتی ہیں جانے کس بدمعاش نے کیسے ان کو کھول کر یہ مال مجھے بدنام کرنے کے لئے ان میں رکھ دیا۔ لیکن پولیس والے کب کسی شریف آدمی کا لحاظ کرتے ہیں۔

بعض لوگ جو ہندوستان سے آتے ہیں۔ بڑی بڑ ہانکا کرتے ہیں کہ ہم وہاں یہ تھا وہ تھا۔ حکیم صاحب کی طبیعت میں انکسار ہے۔ لہذا انہوں نے پاکستان

آنے کے بعد یہاں ڈھنڈورا پیٹنا مناسب نہ سمجھا کہ وہ ہماری مت ہیں کیا تھے کس حیثیت کے مالک تھے۔ آج جب کہ بڑے بڑے سیاسی لیڈر اپنے جیل جانے کا تذکرہ کرتے نہیں تھکتے۔ خواہ وہ رات کی رات جیل میں رہے ہوں اور غلط فہمی رفع ہوتے ہی رہا کردیئے گئے ہوں۔ حکیم صاحب کا اپنے لب سیئے رکھنا اور کسی سے ذکر نہ کرنا کہ وہ تین بار کئی کئی سال کی قید کاٹ چکے ہیں بڑے ظرف کی بات ہے۔ حبِ وطن کا جذبہ ان میں ایسا تھا کہ کبھی انگریز کے قانون کی پروا نہ کی۔ ایک بار نقب لگاتے پکڑے گئے۔ انہوں نے بے خوفی سے اعلان کیا کہ انگریزوں کو زچ کرنے کے لئے ہر وطن دوست کا فرض ہے کہ نقب لگائے یا کسی اور طرح قانون شکنی کرے۔ دوسری بار انہوں نے انگریزوں کے بنائے ہوئے قانونِ شہادت کی خلاف ورزی کی تو غیر ملکی حکومت نے انہیں جھوٹی گواہی دینے کے الزام میں جیل بھیج دیا۔ حالانکہ حکیم صاحب کا کہنا تھا کہ میں نے تو ترکِ موالات کے تحت دیدہ و دانستہ سچ بولنے سے اغماض کیا تھا۔ انگریزوں کی نظر میں یہ ہمیشہ کھٹکتے رہے۔ ایک بار گاڑی میں سفر کر رہے تھے۔ ایک انگریز بھی اسی ڈبے میں تھا۔ تھوڑی دیر میں اس نے شور مچا دیا کہ میری گھڑی کہاں گئی۔ سبھی نے تلاش کرنا شروع کیا۔ حکیم صاحب نے بھی ڈبے کے ایک ایک آدمی کی تلاشی لی اور ڈرایا دھمکایا لیکن کسی نے اقبالِ جرم نہ کیا۔ اس بدتمیز انگریز نے بجائے اس کے کہ ان کا شکریہ ادا کرتا۔ ان کی تلاشی لینے پر اصرار کیا۔ اور سوئے اتفاق سے وہ گھڑی ان کی جیب سے نکلی وہاں کیسے چلی گئی۔ حکیم صاحب آج تک حیران ہیں۔ نہ یہ گھڑی کا عقدہ آج تک حل ہوا۔ نہ یہ کہ ان کی دوسری جیب سے ایک اور مسافر کا جو فونٹن پین نکلا وہ کیسے وہاں آگیا۔

(۲)

میر رئیس الدین کا تعارف ہم سے ہمارے دوست میاں نیک محمد نے

رایا تھا۔ نیک محمد صاحب کا سا نیک نفس آدمی کہیں نہ ملے گا۔ نہ کسی کی برائی کر سکتے ہیں۔ نہ سن سکتے ہیں۔ ایک بار کسی نے ان کے سامنے شیطان کو برا کہہ دیا تھا۔ اس کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ گئے کہ شیطان کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے۔ اس کی خوبیوں پر بھی نگاہ کرو۔ دُنیا کے اتنے آدمی اس کے ہاتھ پر بیعت ہیں۔ اس کے نام کا کلمہ پڑھتے ہیں تو یہ بے وجہ نہیں ہو سکتا، ضرور اس میں کچھ خوبیاں بھی ہوں گی۔

میر صاحب کا تعارف کراتے ہوئے میاں نیک محمد نے کہا کہ انہیں اپنے ہاں نوکر رکھ لیجئے۔ ضرورت مند ہیں۔ ہندوستان میں تھے تو پوتڑوں کے رئیس تھے۔ در پر ہاتھی جھولتے تھے اور ان کا دستر خوان بہت وسیع تھا آج اس حال میں ہیں ورنہ ان کا قلم ہزاروں پر چلتا تھا۔

میاں نیک محمد صاحب کی ایک نیکی یہ ہے کہ جھوٹ کبھی نہیں بولتے۔ لہٰذا میر صاحب کو ہم نے اپنی کمپنی میں منشی رکھ لیا۔ لیکن چند ہی روز میں ان کی خوبیاں ہم پر کھلنے لگیں تو ہم نے میاں نیک محمد سے کہا کہ سودا جو ترا حال ہے ایسا تو نہیں وہ کیا جانئے تو نے اسے کس آن میں دیکھا۔ آپ تو انہیں پوتڑوں کا رئیس بتاتے تھے۔ بولے تم ادیب آدمی ہو۔ میری بات کو محاورہ سمجھے۔ بھئی ہم نے تو ہمیشہ ان کے گھر میں پوتڑے سوکھتے دیکھے۔ اس لحاظ سے کہا تھا۔

اب ہم نے کہا۔ وہ دروازے پر ہاتھی جھولنے والی بات؟ فرمایا۔ ہمارے میر صاحب کا دولت خانہ کانپور میں چڑیا گھر کے پاس تھا۔ وہاں سے ہاتھی گشت کرتے ہوتے نکلتے اور ان کے گھر کے سامنے آکر جھولنے لگتے۔ انہوں نے کئی بار چڑیا گھر والوں سے شکایت بھی کی کہ ان کو باندھ کر رکھا کیجئے۔ میرے گھر کے سامنے آکر گندگی پھیلاتے ہیں۔

ہم نے بات کاٹ کر کہا۔ آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ ان کا دستر خوان بڑا

وسیع تھا۔ ہم نے تو ایسا ندیدہ اور خسیس آدمی کبھی نہ دیکھا۔

فرمایا۔ اس بات کو بھی آپ استعارے ہیں بے گنتے۔ تو میرا کیا قصور، بے شک جزرس آدمی ہیں۔ آج تک کبھی دسترخوان نہ خریدا۔ بستر کی چادر سے دسترخوان کا کام لیتے تھے اور اس کے ایک طرف اکیلے بیٹھ کر چٹنی سے روٹی کھاتے تھے۔

آخر میں ہم نے کہا۔ وہ جو آپ نے کہا تھا کہ ہزاروں پر ان کا قلم چلتا تھا۔ اس کا مطلب بھی کچھ دوسرا ہی ہوگا۔

بولے۔ وہ بھی کچھ جھوٹ نہیں۔ ہمارے میر صاحب ڈاک خانے کے سامنے بیٹھ کر لوگوں کے منی آرڈر لکھا کرتے تھے۔ جانے کتنے ہزار روپے روز کے منی آرڈر ان کے ہاتھ سے نکلتے ہوں گے۔

(۳)

"یہ میرے دوست ہیں۔ بہت شریف آدمی ہیں۔ آپ کی فرم میں جگہ مل سکے تو"

"کس قسم کی جگہ؟"

"منشی رکھ لیجئے۔ جو تشاندے کوٹنے چھاننے کا تجربہ رکھتے ہیں لہذا آپ کے ہاں میڈیکل افسر بھی ہو سکتے ہیں۔ علم نجوم میں بھی دخل ہے۔ آپ کے اسٹاف کے ہاتھ دیکھ دیا کریں گے۔"

"کیا نام ہے؟"

"سید فصاحت حسین"

"والد کا نام"

"جے کے جنجوعہ ۔ جھنڈے خاں جنجوعہ"

"کیا کرتے ہیں ان کے والد"

"جی ان کے والد زندہ ہوتے تو ان کو کام کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ بیچارے یتیم ہیں۔ ان کے والد ان کی پیدائش سے کئی سال پہلے فوت ہو گئے تھے۔"

"والدہ"

"جی ان کا سایہ بھی ان کی پیدائش سے دو سال قبل ان کے سر سے اٹھ گیا تھا۔"

"اور رشتہ دار تو ہوں گے۔"

"جی نہیں۔ اور رشتہ دار بھی کوئی نہیں کیونکہ ان کے دادا لاولد مرے اور پردادا نے شادی ہی نہیں کی تھی۔ یہ تنہا ہیں اس بھری دنیا میں۔"

"کیا کرتے ہیں۔"

حال ہی میں سات سال کی طویل اقامت کے بعد جیل سے رہا ہوتے ہیں۔ وہ نواب آکر ان پر وقت پڑا ہے تو نوکری تلاش کر رہے ہیں۔ ورنہ روپیوں میں کھیلتے تھے۔"

"کیا کرتے تھے۔"

"بس دستکاری اپنے ہاتھ کی محنت کا کھاتے تھے۔ اپنے فن میں وہ دستگاہ بہم پہنچائی تھی کہ بڑے بڑے ان کے آگے کان پکڑتے تھے۔ وہ تو ان کا ایک شاگرد کچا نکل گیا اوچھا ہاتھ پڑا اس کا۔ بٹوے میں سے کچھ نکلا بھی نہیں اور اس کی نشاندہی پر قصا صاحب مفت میں پکڑے گئے۔

"ہمارے ہاں نوکری کے لئے چال چلن کے سرٹیفکیٹ کی ضرورت پڑتی ہے۔"

"وہ ہم داروغہ جیل سے لے لیں گے۔ نیک چلنی کی بنا پر ان کو سال بھر کی چھوٹ بھی تو ملی تھی اس کا سرٹیفکیٹ بھی موجود ہے۔"

"تعلیم کہاں تک ہے۔"

"اجی تعلیم۔ یہ آج کل کے اسکولوں کالجوں میں جو پڑھایا جاتا ہے وہ تعلیم ہوتی

ہے کیا؛ ہم نے بڑے بڑے میٹرک پاسوں اور ڈگریوں والوں کو دیکھا ہے۔ گنوار کے گنوار رہتے ہیں۔"

"اچھا تو فصاحت حسین صاحب آپ عرضی لاتے ہیں نوکری کے لیے ؟"

"جی لایا ہوں۔ یہ لیجئے۔"

"پڑھ کے سنائیے"

"جی میں عینک گھر بھول آیا ہوں۔"

اچھا تو دیجئے۔ اس پر دستخط تو آپ نے کیے ہی نہیں۔ اور یہ کیا سیاہی کا دھبہ ڈال دیا ہے درخواست کے نیچے۔"

حضور یہ دھبہ نہیں ہے۔ میرا نشان انگشت ہے۔ دیکھئے نا بات اصل میں یہ ہے کہ ......"

ذرا فون کر لوں؟

جب تک آپ کے گھر میں ٹیلیفون نہ ہو آپ کبھی اندازہ نہیں کر سکتے کہ آپ عوام الناس بالخصوص اپنے محلے والوں میں کتنے مقبول ہیں۔ ہمیں بھی اس کا پتہ اس وقت چلا جب ہم پچھلے دنوں بیمار ہو کر صاحبِ فراش ہوتے۔

شیخ نبی بخش تاجر چرم ہمارے محلہ دار ہیں۔ ان سے علیک سلیک ہے۔ گاڑھی چھننے والی کوئی بات نہیں۔ ہمیں ان کے حسنِ اخلاق کا بھی اندازہ نہ تھا۔ ہمارے بیمار ہونے کے بعد سب سے پہلے وہی تشریف لاتے۔ ہماری پٹی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئے۔ تعزیت کرنے والوں کا منہ بنایا اور پوچھا۔ کیا شکایت ہے۔

ہم نے کہا: "آپ سے ہمیں کوئی شکایت نہیں، واللہ نہیں۔"

فرمانے لگے "میں تو آپ کی بیماری کا پوچھ رہا ہوں۔" تب ہم نے بتایا کہ معمولی کھانسی بخار ہے۔ بولے "اس کو معمولی نہ جانیے گا۔ میری بیوی کے بھانجے کو بھی یہی عارضہ تھا۔ آپ ہی کی عمر کا رہا ہو گا۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔"

"مر گیا؟" ہم نے بوکھلا کر پوچھا۔

فرمایا "ہمارے لیے تو مر ہی گیا۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے کینیڈا چلا گیا۔ وہاں سنا ہے شادی کر لی۔ ہمیں تو اب خط بھی نہیں لکھتا۔"

ہم نے حیاتِ تازہ پا کر اطمینان کا سانس لیا۔ کچھ رشک ان کی بیوی کے بھتیجے کی

قسمت پر بھی آیا۔ بہر حال ہم نے ان بزرگ سے کہا کہ آپ نے ناحق مزاج پرسی کے لئے آنے کی زحمت فرمائی۔ بہت بہت شکریہ۔

اُٹھتے اُٹھتے اتفاق سے ان کی نظر ہمارے فون پر پڑ گئی۔ بولے۔ اپنی دکان پر فون کر لوں؟ جو شخص اتنی محبت سے حال پوچھنے آئے۔ اس سے کیا دریغ ہو سکتا ہے۔ ہم نے کہا۔ شوق سے کیجئے۔

وہ گئے ہی ہوں گے کہ ریٹائرڈ تھانیدار اور حال ٹھیکیدار میر باقر علی سندیلوی لٹھیا ٹیکتے آئے۔ بولے سُنا تھا آپ کے دُشمنوں کی طبیعت ناساز ہے۔

"ہمارے دشمنوں کی تو نہیں۔ ہمیں ضرور کھانسی بخار ہے۔" ہم نے وضاحت کی۔

نہایت شفقت سے ہماری نبض ٹٹولتے ہوئے بولے "کچھ دوا دارو کرو۔ احتیاط رکھو۔ تم ایسا ادیب اور انشا پرداز کم از کم ہمارے محلے میں تو کوئی اور نہ ہوگا۔ اگر خدانخواستہ قضا و قدر کے کان بہرے۔ کوئی ہرج مرج ہو گیا تو ادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ جائے گا۔"

انہوں نے کچھ کہا۔ ہم اپنی وحشت میں کچھ اور سمجھے۔ چنانچہ بہ آواز بلند عرض کیا کہ قبلہ یہ سن کر افسوس ہوا کہ آپ کے کان بہرے ہو رہے ہیں۔ ان میں باقاعدہ چنبیلی کا تیل گرم کر کے ڈالا کیجئے۔ اب رہا نقصان، سو ٹھیکیداری میں نفع نقصان تو ہوتا ہی ہے۔"

اس پر ہمارے ایک دوست نے جو ہمارے پاس بیٹھے تھے۔ ہمیں جھنجوڑا اور میر صاحب سے معذرت کی کہ معاف کیجئے۔ یہ شخص یونہی بہکی بہکی باتیں کیا کرتا ہے۔ آپ کی مزاج پُرسی کا شکریہ۔

اس پر انہوں نے فرمایا کہ مزاج پُرسی تو میرا بحیثیت مسلمان اور ہم محلہ ہونے

لیے عین فرض تھا۔ اس میں زحمت کی کوئی بات نہیں۔ پھر اُٹھتے ہوئے "میرا لڑکا نالائق صبح سے بھٹے پر گیا ہوا ہے، میں یہاں اینٹوں کے ٹرک کا انتظار کر رہا ہوں۔ اجازت ہو تو اسے فون کر لوں"۔

شوق سے کیجیے۔ ہم نے کہا آپ ہی کا فون ہے۔

اس کے بعد پروفیسر کے بخش کے آنے کی اطلاع ہوئی۔ ان کے نام نامی سے کون واقف نہیں۔ سعید منزل کے سامنے بیٹھتے ہیں اور قسمت کا حال بتاتے ہیں۔ مقدمہ بیماری، روزگار ہر مسئلے پر ان کا مشورہ مفید رہتا ہے۔ لاعلاج بیماریوں کے مایوس مریضوں کا علاج بھی کرتے ہیں۔ نام کریم بخش ہے اور پروفیسر بننے سے ہمارے ایک عزیز کے ہاں خانساماں تھے۔ ان کی راہ و رسم ہم سے انہی دنوں سے ہے۔ آتے۔ بیٹھے۔ ہمارا حال پوچھا۔ پھر ہمارے ڈاکٹر کا نام پتہ دریافت کیا۔ پھر ڈاکٹروں اور ڈاکٹری طریقہ علاج کے متعلق کچھ چار حرفی ناقابل طباعت کلمات ارشاد فرمائے۔ اس کے بعد تشخیص کی اور کہا۔ تمہارے جسم میں شکر کی کمی ہے۔ اور گلا خراب ہے۔ اپنے مجربات میں سے بھی ایک چیز بھیجنے کا وعدہ کیا جو سینڈک کی چربی، گندھک اور لال ٹڈے کے انڈوں سے بنتی ہے اور اُلو کے مغز کے ساتھ نہار منہ کھانی پڑتی ہے۔ یہ بھی اُٹھتے ہوتے ٹیلی فون پر ایک جگہ آرڈر دے، گئے کہ آدھا سیر گھیکوار اور دو نیولے مجھے کل میرے فٹ پاتھ پر بھجوا دیئے جائیں۔

ہم تو لوگوں کے اخلاق کریمانہ کے ممنون ہوتے رہ گئے۔ ہمارے بھائی نے، ہمارے نہ نہ کرتے ہوئے بھی کمرے میں نوٹس لگا دیا کہ جو صاحبان مزاج پرسی کو آئیں وہ فون کو ہاتھ نہ لگائیں اور جو فون کرنے آئیں وہ مزاج نہ دریافت کریں۔

ہم ملازمت پیشہ آدمی ہیں۔ رات کے وقت گھر پر ہوتے ہیں۔ خدا جانے لوگوں کو کیسے

گمان ہوگیا کہ ہم نے میٹرنٹی ہوم کھول رکھا ہے۔ حالانکہ ہمیں پچھلے دنوں محکمہ فیملی پلاننگ نے سند خوشنودی عطا کی ہے کہ لوگ تو بچوں کے معاملے میں احتیاط برتتے ہیں۔ آپ ان سے بھی زیادہ دور اندیش ہیں۔ بہر حال دن میں چار چھ فون ضرور اس قسم کے آتے ہیں۔

"ذرا میری بیگم صاحبہ کو بلا دیجئے۔"

"میرے ہاں لڑکا ہوا یا لڑکی۔ اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے؟"

"ذرا ایمبولنس بھیج دیجئے۔ جلدی کیجئے۔ میں سیٹھ بھولو بھائی مٹی کے تیل والا کھارادر سے بول رہا ہوں"۔ اگر ہم کہیں کہ ایمبولنس ہمارے پاس نہیں ہے اور نہ ہمیں آپ کی بیگم صاحبہ سے تعارف ہے نہ ہم آپ کی اولاد نرینہ و مادینہ میں اضافے کے مشتاق ہیں۔ تو جواب ملتا ہے۔ "یہ کیسا میٹرنٹی ہوم کھول رکھا ہے آپ نے۔ میٹرنٹی ہوم ہے یا یتیم خانہ۔"

کتنی بار جی چاہا ان سے کہیں کہ آپ کے بچوں کی رعایت سے اس کے یتیم خانہ ہونے میں آپ ہی کا نقصان ہے۔ لیکن پھر مختصراً عرض کرتے ہیں کہ جی یہ میٹرنٹی ہوم نہیں۔ ایک یکہ و تنہا آدمی کا گھر ہے۔ اگرچہ کراچی کی شرح پیدائش دیکھنے کے بعد جی ہمارا بھی یہی چاہتا ہے کہ کاش یہ ہمارا گھر نہ ہوتا میٹرنٹی ہوم ہوتا۔ جس جگہ کے لئے یہ فون کئے جاتے ہیں، اس کے اور ہمارے فون نمبر میں فقط ایک عدد کا فرق ہے۔

یہی نہیں۔ ایک حلوہ مرچنٹ کا نمبر بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ ہمیں اکثر فرمائشیں اس قسم کی آتی ہیں کہ پندرہ سیر لڈو بھیج دیجئے اور ایک ٹوکرا بالوشاہیوں کا بھی۔ اصلی گھی کا۔ پچھلے کی طرح چربی یا تل کے نہ بھیج دیجئے گا۔ ایک بار ان حلوہ مرچنٹ صاحب سے ہماری ملاقات بھی ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ اکثر مشاعروں کے لئے غزلوں کی فرمائش ان سے کی جاتی ہے۔ اور رسالے والے تو ہمیشہ سر رہتے ہیں۔ کہ آپ کی نگارشات کا انتظار ہے۔ سالنامہ نکل رہا ہے جلدی کیجئے۔

بعض لوگ صبر والے ہوتے ہیں، ہمیں ساری رانگ نمبر کہنے کی مہلت مل جاتی ہے

لیکن بعضوں کو جلدی بھی ہوتی ہے۔ ایسے ہی ایک صاحب کا کل فون آیا:

"لکھئے چار چھولداریاں"

ہم نے عرض کیا۔ "معاف فرمایئے ......"

بات کاٹ کر بولے "باتوں کا وقت نہیں۔ لکھتے جایئے۔ بارہ ڈنر سیٹ اچھے ہوں پہلے کی طرح پھینچو نہ ہوں"

ہم نے پھر کھنکار کر کہا۔ "اجی سنئے تو ...."

درشتی سے بولے چار چاندنیاں بھی ڈال دیجئے۔ صاف ہوں۔ سالن گری نہیں چاہئیں۔ ہمارا پیسہ حلال کا پیسہ ہے"

ہم نے پھر کچھ کہنا چاہا۔ لیکن ...... لیکن ادھر سے حکم ہوا کہ پہلے ان کی فرمائش نوٹ کی جائے پھر بات کی جائے"

"اٹھارہ ڈونگے۔ بہتر پلیٹیں۔ پانچ لالٹینیں۔ ڈیڑھ سو چمچے۔ دس جگ"

ہم سب لکھتے گئے۔ جب وہ ذرا دم لینے کو رکے تو ہم نے کہا "قبلہ۔ ہم فقیر آدمی ہیں۔ ہم اتنی ساری چیزیں یہ خس وخانہ برفاب کہاں سے لائیں گے؟

ادھر سے سوال ہوا "آپ حاجی چراغ دین اینڈ سنز نہیں کیا"

ہم نے کہا۔ جی نہیں۔ کاش ہوتے۔

بھڑک کر بولے "آپ نے پہلے کیوں نہ کہا۔ اچھے آدمی ہیں آپ۔

کچھ اور ٹکٹ کچھ اور اُمیدوار

ہم نے اس روز ریلوے کے ریٹائرڈ گارڈ میر ولدار علی سندیلوی کا ذکر کیا تھا۔ جن کو صوبائی اسمبلی کے لیے کسی اور پارٹی کا ٹکٹ نہ ملا تو ریلوے کے ٹکٹ پر ہی کھڑے ہو گئے ہیں یہ غالباً ریٹرن ٹکٹ ہو گا۔ جس میں فائدہ یہ ہے کہ آدمی اور کچھ نہیں تو اپنے گھر تو واپس آ سکتا۔ دوسرے ٹکٹوں والوں کا تو یہ دیکھا ہے کہ بعض اوقات نہ گھر کے رہتے ہیں نہ گھاٹ کے۔ پروگرام میر صاحب قبلہ کا یہ ہے کہ وہ تحریک پاکستان کے مخلص کارکنوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کریں۔ میر صاحب کے طویل تجربے کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ واقعی کریں گے لیکن انہیں کچھ اور چوکسی اور مستعدی دکھلانے کی ضرورت ہے یہ نہ ہو کہ مخلص کارکنوں کو ایک پلیٹ فارم پہ جمع کرتے کرتے خود اتنے لیٹ ہو جائیں کہ گاڑی نکل چکی ہو پٹڑی چمک رہی ہو

میر صاحب مذکور کی الیکشن مہم آج کل چھکا چھک جا رہی ہے۔ تقریریں ایسا فرما رہے ہیں کہ بڑے بڑے جنکشن منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ بیچ میں فقط ایک آدھ جگہ رکتے ہیں۔ وہ بھی پانی لینے یعنی پانی پینے کے لئے ان کی ایک آدھ تقریر ہم نے بھی سنی ہے۔ فرمایا آپ نے۔

حضرات یہ دنیا مسافر خانہ ہے۔ ہم سب یہاں پسنجر کے موافق ہیں۔ پس جتنے دن زندگی

کی گاڑی چلتی ہے۔ محبت اور اخوت کا سگنل ڈاؤن رکھنا چاہئے اور نفرت و عناد کو ہمیشہ لال جھنڈی دکھانی چاہئے۔ غریب اور امیر کا ذکر کرتے ہوئے میر صاحب نے کہا کہ "اس وقت ہمارے معاشرے میں بڑی ابتری ہے۔ فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے لوگ تو عیش کی سیٹیاں بجاتے ہیں ہم انٹر کلاس اور تھرڈ کلاس لوگ جوتیاں چٹخاتے ہیں۔۔۔۔؟"

حاضرین میں سے کسی نے نعرہ لگایا کہ اسلام خطرہ میں ہے۔ میر صاحب ترنت لپکے "اسلام خطرے میں نہیں ہے۔ بار بار خطرے کی زنجیر مت کھینچو۔ یہ قانون کے خلاف ہے۔ جرمانہ دینا پڑے گا۔"

ریلوے کا سنا تو ایک صاحب پی آئی اے کے ٹکٹ پر کھڑے ہو گئے۔ آج کل اس قسم کی تقریریں کر رہے ہیں۔

لیڈیز اینڈ جنٹلمین، سلام علیکم کیپٹن فلک سیر آپ کو الیکشن پرواز ۹۰۰ پر خوش آمدید کہتا ہے۔ اپنے حفاظتی بند باندھ لیجئے اور سگریٹ نوشی سے پرہیز کریں۔ ہم پینتیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے اور خیالی پلاؤ کھاتے ہوئے انشاء اللہ مہینہ بھر میں اسمبلی چیمبر میں جا اتریں گے۔ راستے میں داہنی طرف اچھرہ موڑ آئے گا اور بائیں طرف لاڑکانہ کے پیپلوں کے جھنڈ پڑیں گے۔ ہم ان کو بے نیازانہ دیکھتے ہوئے گزریں گے۔ امید ہے کہ آپ کا سفر خوشگوار گزرے گا۔ دھنیہ باد۔ شکریہ۔ تھینک یو۔

ہوائی جہاز کا ٹکٹ حاصل کرنا ایسا آسان نہیں۔ ریلوے کی کھڑکی پر بھی کبھی رش ہو جاتا ہے۔ لہذا ہمارے کرم فرما خان نبارس خان نے لانڈھی سے اومنی بس کے ٹکٹ پر کھڑے ہونا پسند کیا ہے۔ انہوں نے الیکشن کی مہم کا آغاز کرتے ہوئے اپنے کارکنوں کو اشارہ کیا ہے کہ "جانے دو بس" اپنی تقریر کا آغاز وہ ہمیشہ کسی نہ کسی شعر سے

کہتے ہیں "آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں - سامان سو برس کے ہیں پل کی خبر نہیں" ان کا نعرہ ہے کہ "ہارن دے کر پاس کریں" اور تقریر کا انداز یہ ہے۔

بابو - ادھر آجاؤ - پائیدانوں پر مت کھڑے ہو جیب پاکٹ سے ہوشیار - آج کل ووٹ کرتے بہت ہو گئے ہیں - ہاں تو بابو - تم ام کو سیٹ پر بٹھاؤ - ام تم کو سیٹ پر بٹھائے گا - کسی کو کھڑا نہیں رکھے گا - ہمارے ہاں پارٹیاں بہت ہیں لیکن سب دھواں چھوڑ رہی ہیں - امیدواروں میں کسی کا بریک فیل ہے - لوئنا شروع کرتا ہے تو رکتے رکتے بھی آدھ گھنٹہ اور لگا دیتا ہے - کسی کی باڈی پرانی ہے بعضوں کے تو سائیلنسر بھی کام نہیں کرتے جیسے ہمارے اوکاڑے والے مولوی صاحب کے - پس ام کو ووٹ دو ...

ارے اُٹھ کر کدھر جاتا ہے، ابھی ہمارا تقریر کہاں ختم ہوا ہے -

ہر بشر کو ہے یہ لازم صبر کرنا چاہیئے
جب کھڑی ہو جائے گاڑی تب اترنا چاہیئے

اتفاق سے ایک ٹکٹ ڈاک کا بھی ہوتا ہے - بابو محمد دین سابق پوسٹ ماسٹر کو اسی پر کھڑے ہونے میں سہولت نظر آئی ان کی تقریر بھی ہم نے سنی ہے:

"محترم حضرات! السلام علیکم - مزاج شریف - آپ سب کو ہمارا درجہ بدرجہ سلام پہنچے - ہمارے تھیلے میں باتیں تو بہت ہیں لیکن سارٹ کر کے فقط چند ایک آپ کی خدمت میں پیش کروں گا - یہ جتنے امیدوار ہیں - سب کے دلوں پر مہریں لگی ہوئی ہیں ان کی باتیں محض لفافہ ہیں - اندر کچھ بھی نہیں - کسی کا پتہ نہیں کہ کب بیرنگ ہو جائے یا پوری قوم کو ڈیڈ لیٹر آفس دھکیل دے - ووٹر حضرات سے التماس ہے کہ میرے خط کو تار سمجھیں - یعنی میری گذارشات پر توجہ فرمائیں اور پولنگ کے روز اپنے اپنے ووٹ قریب ترین لیٹر بکس میں ڈال دیں - باقی سب خیریت ہے - والسلام"

متوالا کا نام تو آپ نے سنا ہو گا۔ فلمی دنیا کی مشہور شخصیت ہیں۔ یہ بھی الیکشن میں کھڑے ہیں اور ان کے پاس سینما کا ٹکٹ ہے۔ یہ اپنی تقریر کا مکھڑا عموماً کسی فلمی گیت سے باندھتے ہیں۔ مثلاً اے دیکھنے والے دیکھ کے چل۔ ہم بھی تو کھڑے ہیں راہوں ہیں" اس کے بعد فرماتے ہیں۔

"حضرات! قوم کی خدمت کرنا آسان کام نہیں۔ لیکن میں یہ سوچ کر کھڑا ہو گیا ہوں کہ جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔ اور چھپ چھپ آہیں بھرنا کیا؟ کھڑا ہونا میرا کام تھا۔ اب مجھے ممبر بنانا آپ کا کام ہے یعنی اب یہ تہاڈی عزت دا سوال اے۔

صاحبان! آپ کے پاس طرح طرح کا امیدوار آئے گا۔ طرح طرح کی ایکٹنگ کرے گا اور ڈائلاگ بولے گا۔ ان سے ہوشیار۔ ان کے رونے گانے پر نہ جائیے گا سب پلے بیک ہے۔ خاکسار کی پوری عمر قوم کی خدمت میں، ہیرسل کرتے گذری ہے۔ اب تو اسے قومی ہیرو بننے کا موقع ملنا چاہیئے۔ آپ اس شیراں دے پتر شیر کو ووٹ نہ دیں گے تو اوہ کسے دیں گے ــــ؟

ایک روز ان کے جلسے میں ایک صاحب نے کھڑے ہو کر کوئی اعتراض کرنا چاہا آپ نے فوراً آواز لگائی، "کٹ" وہ وہیں بیٹھ گیا۔

خان شیر خان گاندھی گارڈن کے علاقے سے کھڑے ہوتے ہیں اور ان کے پاس چڑیا گھر کا ٹکٹ ہے۔ ان کی تقریر بھی سننے کی ہوتی ہے۔

صاحبان، آج کل ہر کوئی اپنی اپنی بولی بول رہا ہے۔ دھاڑ رہا ہے۔ چنگھاڑ رہا ہے۔ لیکن ہاتھی کی طرح ان کے کھانے کے دانت اور ہیں اور دکھانے کے اور۔ قوم کے لئے قربانی دینے کا وقت آئے گا تو سب کو سانپ سونگھ جائے گا۔ طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں گے۔ دم دبا کر بھاگ جائیں گے۔ یاد رکھئے۔ ان لوگوں کا آگا فیر کا

اور پیچھا بھیڑ کا ہے۔ بگلا بھگتوں کو ووٹ مت دیجیے۔ خاکسار کو دیجیے کہ ع
شاہیں را بلند است آشیانہ۔

سب سے مختصر تقریر مرزا برکت اللہ بیگ کی ہوتی ہے۔ یہ لاٹری کے ٹکٹ پر کھڑے ہیں۔

بھائی صاحبان۔ میں تو صرف اتنا کہوں گا کہ مجھے ووٹ دیجیے اور اسمبلی میں پہنچا دیجیے۔ اس کے بعد میں آپ کی خدمت کرتا ہوں یا آپ کو دغا دیتا ہوں۔ یہ آپ کی قسمت کی بات ہے۔

آج کچھ فلموں کے بارے میں

ایک اخبار کے فلمی صفحے پر ایک عنوان نظر آیا۔ "تیز رو فلمسازی کا نیا ریکارڈ" معلوم ہوا کہ ایک مشہور ہدایت کار نے ایک مشہور فلمساز کی فلم دو مہینے میں بنا کر ڈال دی ہے۔ جلدی کام شیطان کا ہوتا ہے لیکن اس ہدایت کار کا نام اگرچہ اسی قافیے میں ہے لیکن کچھ اور ہے۔

۱۹۵۹ء میں ہم پہلی بار ڈھاکے گئے تو ہمیں نیو مارکیٹ کے قریب پارٹی ہاؤس میں ٹھہرایا گیا۔ ہم نے پوچھا کیا یہ کمیونسٹ پارٹی کا دفتر ہے۔ اس کا شبہ کچھ نام سے ہوا، کچھ اس عمارت کی بے سروسامانی سے۔ لوگوں نے بتایا جی نہیں۔ یہ اسمبلی کی حکمران پارٹی کے ممبروں کے ٹھہرنے کو بنایا گیا ہے۔ اور آپ یہ سن کر حیرت کریں گے کہ یہ پوری عمارت دو ماہ میں بنی ہے۔ ہم نے میزبانوں کے حسب فرمائش حیرت کی اور دہانے پھاڑ کر کہا۔ اچھا؟ تھوڑی دیر میں ایک اور صاحب خاص یہ بات بتلانے کو تشریف لائے کہ یہ عمارت دو مہینے میں تیار ہوئی۔ ہم نے پھر کہا۔ خوب ہے۔ کمال ہو گیا۔ لیکن جب ایک تیسرے صاحب نے آکر کہا کہ حضرات کیا آپ یقین کر سکتے ہیں کہ یہ پلیٹی ہاؤس دو ماہ میں بنا تو کہنا پڑا کہ واقعی یقین نہیں کر سکتے کہ اس میں دو مہینے لگ سکتے ہیں۔ کیا ان کام چور انجینئروں اور مزدوروں کو کوئی سزا بھی ملی۔

اس تاریخی عمارت کے ایک کمرے میں ہم ابراہیم جلیس اور مشہور افسانہ نگار

اسے حمید فروکش ہوتے۔ اسے حمید سے بے احتیاطی یہ ہوئی کہ بات کرتے کرتے اس پلنگ پر آگئے۔ جس پر ہم پہلے سے بیٹھے تھے۔ تڑاخ کی آواز آئی اور وہ زمین پر آرہے خیر وہ اُٹھ کر دوسرے پلنگ پر چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں انہوں نے کسی بات پر قہقہہ مارا تو ان کا پلنگ بھی تاب نہ لاسکا۔ اور بیٹھ گیا۔ ابراہیم جلیس چلاتے "ارے کیا ہوا؟" یہ ان کی غلطی تھی۔ اِن کو آہستہ بولنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ کمرے میں آہستہ بولنے کی تختی بھی لگی تھی۔ خیر اب کیا ہوسکتا تھا۔ ان کا پلنگ بھی شہید ہوا۔ ہمارے کہنے پر اور نیک چلنی کا مچلکہ داخل کرنے پر ہمیں ایک دوسرا کمرہ دیا گیا۔ جس میں نہایت آہستگی سے جاکر ہم اپنے اپنے پلنگ پر لیٹ گئے۔ بیچ میں کہیں کھانسنے کی ضرورت پیش آئی تو پلنگ سے اتر کر ان حوائج کو رفع کرتے تھے۔ پھر پلنگ پر جاکر لیٹتے تھے۔

مقصود اس حکایت کا یہ ہے کہ کہیں لوگ فلم مذکور دیکھ کر بھی یہ نہ کہیں کہ اسے اس میں ایسی کون سی بات ہے جو ڈائریکٹر نے دو مہینے لگا دیئے۔ شاید اسٹوڈیو خالی نہ ملا ہوگا یا کوئی اداکار بیچ میں بیمار ہوگیا ہوگا۔

اخباروں کے مراسلات اور اداریوں میں اکثر لکھا جا رہا ہے کہ ہماری فلمیں صحت مند رجحانات کی حامل ہونی چاہئیں۔ ہم خود آج کل کی فلموں کی بے راہ روی سے ناخوش ہیں۔ ممتاز حسن صاحب نے ایک بار لاہور میں فرمایا تھا کہ صحت مند ادب صحت مند ادیب ہی پیدا کرسکتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے سامنے رائٹرز گلڈ کے احاطے میں اکھاڑہ بھی کھدوا آتے تھے۔ فلموں کی اصلاح کی بھی یہی صورت نظر آتی ہے۔ پچھلے دنوں کسی صاحب نے "رستم وسہراب" نام کی ایک نئی فلم بنانے کا عزم کیا تو ہمارے ایک مشہور افسانہ نگار دوست بھاگے گئے کہ میں کہانی لکھوں گا۔ فلم ساز کوئی بڑے ہی بکڑے دل تھے۔ بولے میاں کہانی پہلوانوں کے متعلق ہے۔ تم نے اپنی شکل آئینے میں دیکھی؟

ہمارے یہ دوست واپس آ گئے۔ اور غالباً عمر میں پہلی بار آئینہ دیکھا۔ لیکن مایوس نہیں ہوتے۔ آج کل باقاعدہ یخنی، بادام کی ٹھنڈائی، خالص پنجاب کے گھی اور دیگر مقویات کا استعمال کر رہے ہیں۔ اور سر گھٹوا، گلے میں تعویذ پہن، صبح شام ڈنڑ بیٹھکیں بھی لگا رہے ہیں۔ گانوں کے بارے میں ایسی کسی تیاری کی ضرورت نہیں۔ گیت نویسوں میں کون ہے جو اپنے فن کا پہلوان نہیں اور محاورے اور عروض کو پٹخنیاں نہیں دیتا۔ ہم نے تو ہمیشہ یہ دیکھا ہے کہ اس دنگل میں فتح مبین ہمیشہ گیت نویس کی ہوتی ہے۔ بحور و اوزان اور شاعری کے دیگر اصول و قواعد چاروں شانے چت نظر آتے ہیں۔

عام خیال یہ ہے کہ ہماری نئی پود میں جتنی خرابیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ سب فلم کے راستے آئی ہیں۔ سنسر بورڈ میں علما و صلحا کو شامل کر کے دیکھ لیا گیا لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ ہمارے ایک بزرگ کا کہنا ہے کہ تبدیلیاں بنیادی ہونی چاہئیں۔ ہم نے ان سے عرض کیا کہ ذرا وضاحت سے اور مثالیں دے کر واضح کیجئے۔ بولے۔ کہاں کے رہنے والے ہو تم؟ ہم نے بتایا کہ لاہور کو ہمارا وطن مالوف ہونے کا شرف حاصل ہے۔ فرمایا تو پھر یوں سمجھ لو کہ فلم کا ہیرو لاہور میں تمہارے علاقے کا مثالی نوجوان ہونا چاہیئے۔ تہمد زیب تن کئے۔ پمپ شو پہنے اور رومالی کاندھے پر ڈالے مونچھوں کو موم لگا کر تاؤ دیتا ہوا۔ یہ ہو تو چند دن میں دیکھ لو گے کہ تمام نوجوان یہی وضع بنا کر باہر نکلتے ہیں۔ کہ نہیں۔ ہم نے کہا یہ تو ہیرو ہوا۔ ہیروئن کے متعلق بھی فرمایئے۔ بولے بہت ضرورت ہو تو ہیروئن کو لٹھے کا سیدھا سفید برقع پہنا کر فلم میں لایا جا سکتا ہے۔ لیکن میرے نزدیک ہیروئن کی چنداں ضرورت نہیں۔ فقط اس کے والدین کا ہونا کافی ہے۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ پھر ہیرو عشق کس سے کرے گا۔ اور کہانی آگے کیسے چلے گی۔ بولے ساری خرابی تو عشق و عاشقی کی ہے۔ یہ مخرب اخلاق باتیں فلم میں نہیں ہونی چاہئیں۔ ہیرو کا سرپرست سیدھے سیدھے

ہیروئن کے والدین کے پاس جا کر کہیے کہ عزیزی محمد رمضان کو اپنی فرزندی میں قبول فرمایئے اور اپنی دختر نیک اختر کنیز فاطمہ سے اس کے نکاح کی تاریخ مقرر کر دیجئے۔ یہ ضروری ہے کہ ہیرو ہیروئن کے نام ٹیڈی نہیں بلکہ شریفوں کے سے ہوں۔ لڑکی کے والدین زیادہ سے زیادہ یہ پوچھیں گے کہ برخوردار کرتا کیا ہے۔ سو ادھر سے جواب بالصواب ملے گا کہ گوالمنڈی میں دودھ کی دکان ہے۔ خوب چلتی ہے۔ اس کے بعد نکاح ہو گا۔ چھوہارے بٹیں گے۔ اور فلم ختم۔ ہم نے عرض کیا کہ یہ تو پانچ، سات منٹ کی کہانی ہو گئی۔ اس سے کیسے کام چلے گا! فرمایا۔ عزیزم وقت کی قدر کرنی سیکھو۔ آج کل لوگوں کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ بیچ میں رقیب یا ظالم سماج کو لا کر شائقین کو ناحق دو ڈھائی گھنٹے تک سینما ہال میں باندھے رکھنا کہاں کا انصاف ہے؟

ہم تو چپ ہو گئے لیکن ان بزرگ نے اپنا سلسلہ تقریر جاری رکھا اور کہا، یاد رکھو ہمیں ایسے ہیرو مطلق نہیں چاہئیں جو مٹرا پی کر آوارہ ہوں، آوارہ ہوٹ کی ہانک لگاتے پھریں یا بے سری آواز میں گھگھیائیں؟ یارو مجھے معاف رکھو میں نشے میں ہوں، ہمارے ہیرو کو تو چھاتی ٹھونک کر الٹے ہاتھ سے بڑا بلا کر یوں للکارنا چاہیئے۔ آدتے برے ہٹ کے گل کر۔ اسیں لسی پیتی ہوئی اے۔

فلمساز حلقوں میں اس بات پر تشویش کی لہر دوڑ گئی ہے۔ کہ نوجوان ایکٹرسیں دھڑا دھڑ شادی کر رہی ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ڈائرکٹر صاحب زر کثیر خرچ کر کے سیٹ کھڑا کرتے ہیں۔ اداکاروں کو مکالمے یاد کراتے ہیں۔ اور اسپروگی گولیاں کھاتے ہیں۔ اما بعد ہیروئن کے گھر آدمی بھیجتے ہیں کہ شتابی سے تشریف لائیں۔ تھوڑی دیر میں آدمی جواب لاتا ہے کہ جی وہ تو ہاتھ پاؤں میں مہندی رچاتے بیٹھی تھیں۔ ڈھولک بج رہی تھی۔ ان کی نانی صاحبہ نے یہ شادی کا کارڈ دیا ہے اور تاکید کی ہے کہ ڈائرکٹر صاحب اور پروڈیوسر صاحب اس

مبارک موقع پر ضرور تشریف لائیں۔ اور بعد نکاح مسنونہ ماحضر تناول فرمائیں۔ زیادہ بھاری تحفہ لانے کی ضرورت نہیں۔ ہاں کیمرہ ہیں موجود ہو تو اس کو ہمراہ لاکر اس موقع کی ایک فلم ضرور کھینچ لیں۔

ہمارے دیکھتے دیکھتے ان دو تین سال میں کتنے ہی فلمی ستارے شادیاں کر کے آفتاب بن گئے۔ اگر ہم پوچھیں کہ مس بدر منیر کہاں گئیں۔ آج کل فلموں میں نظر نہیں آتیں۔ تو جواب ملتا ہے کہ جناب وہ ایک ٹھیکیدار سے شادی کر کے بالکل بی بی نیک پروین بن گئی ہیں۔ پابند صوم وصلوٰۃ ہیں۔ کشیدہ کاری سے شغف ہے۔ میاں کے کپڑے خود دھوتی، استری کرتی ہیں۔ حج کے لئے نام دے رکھا ہے اگر قرعہ نکل آئے تو۔

اگر یہی قحط الرجال جاری رہا تو فلمسازوں کو لنڈے بازار اور جونا مارکیٹ کے مال پر گزارہ کرنا پڑے گا۔ کوئی دن ہیں اسٹوڈیو میں یہ منظر نظر آیا کرے گا کہ ہیرو کو آواز پڑی ہے تو لڑکا جواب لاتا ہے کہ جی وہ تو میک اپ روم میں بیٹھے خضاب لگوا رہے ہیں۔ اور اپنی توند پر پٹی بندھوا رہے ہیں۔ ہیروئن کی ڈھنڈیا پڑتی ہے تو تھوڑی دیر میں وہ لاٹھی ٹیکتی برآمد ہوتی ہیں۔ ڈائریکٹر کہتا ہے۔ کیوں بی، دیر کیوں ہوئی۔ تو فرماتی ہیں، بیٹا کیا کروں۔ بتیسی ٹھیک کرانے کے لئے دندان ساز کے پاس بھیج رکھی تھی کم بخت ٹھیک کام نہیں کرتا۔ آئے دن کوئی خرابی ہو جاتی ہے۔ چند دن میں پتہ چلتا ہے کہ ثقل سماعت کا عارضہ بھی ہو گیا ہے۔ اداکاروں کو ہدایت کرنی پڑتی ہے کہ ہیروئن سے خطاب کریں تو مکالمے ذرا بلند آواز سے بولیں۔ گنج کی کوئی ایسی بات نہیں۔ وگ سے ڈھانپا جا سکتا ہے۔ آواز بہر صورت پلے بیک ہوتی ہے۔ اور اس میں رعشے کا اثر آنے کا اندیشہ نہیں۔ ولن کو آنے کو دیر ہوتی ہے تو دریافت ہوتا ہے کہ جوڑوں کے درد میں پڑا ہے۔ سانس کی تکلیف بھی ہے۔ کیا کہیے یک پیری و صد عیب۔

ہمارے ایک فلمساز دوست نے اس صورت حال میں اپنے لیے ایک نئی راہ نکالی ہے۔ جس میں بقول ان کے دین و دُنیا دونوں کی فلاح ہے۔ ہوا یہ کہ فلم کی کاغذی تیاریاں مکمل کرنے کے بعد، جس میں چنداں دقت پیش نہیں آتی۔ کیوں کہ کہانی اور گانے ان کے اپنے تھے انہوں نے ہیرو، ہیروئن کے بھاؤ پوچھے۔ ان کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی، جب معلوم ہوا کہ مس معرکہ آرا چالیس ہزار روپے سے کم نہیں لیتیں۔ مس چراغ رُخ زیبا نے کہا کہ میں اگلے پانچ سال تک آنے والی فلموں کے لیے بک ہوں۔ تاہم بیس ہزار روپے ایڈوانس ملے تو غور کروں گی۔ مشہور رقاصہ مس بی جمالو نے عذر شرعی کیا کہ اب میں پردہ نشین ہو گئی ہوں۔

ے فلم کی بات بیسوا جائیں ہم بہو بیٹیاں یہ کب جائیں

ذبیحہ بیگم اپنے بڑے لڑکے کی شادی کے انتظامات میں مصروف پائی گئیں۔ مس نانی کا نواسہ بیمار تھا۔ ہیروؤں میں میاں خرگوش کا رکا بھاؤ تو بہت تیز نکلا۔ سنا کہ فقط بونس واؤچر پر بل سکتے ہیں۔ ناچار ان دوست نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی بیوی کو برقع پہنا کر فلم میں ہیروئن لائیں گے۔ اس کے لیے کہانی اور سیناریو میں کچھ ترمیم کرنی پڑی جس کے لیے محلے کی مسجد کے خطیب مولوی عبدالولی حاقی سے خاصی مدد ملی۔ جو ایک شعلہ طراز ادیب ہیں اور مولوی فاضل کی سند رکھتے ہیں۔ ہم نے منظر نامہ دیکھا ہے۔ نام فلم کا "حیا کی بیٹی" ہے۔ اگرچہ مولوی حاقی صاحب مصر تھے کہ اُسے بنتِ مومن کہا جائے۔ ساری فلم میں ہیروئن نہ برقع اٹھاتی ہے نہ کسی نامحرم سے کلام کرتی ہے کبھی کبھی سر ضرور ہلاتی ہے ہیرو کا کام ہمارے فلم ساز دوست خود کریں گے۔ اس میں کوئی امر مانع نہیں کیوں کہ حسن صورت ایک اضافی چیز ہے۔ اصل چیز حسن سیرت ہے۔ جس سے یہ مالا مال ہیں۔ پھر کہانی میں عشق کے اجزا یکسر خارج کر دیئے گئے ہیں۔ سارا وقت مسئلے مسائل پر گفتگو رہتی ہے۔ ہر سین کا اختتام اذان کی روح پرور آواز پر ہوتا ہے جسے سنتے ہی ہیرو لوٹا

اُٹھا کر کہتا ہے۔ اچھا تو محترمہ اب میں چلا نماز کو، پھر ملیں گے۔ اگر خدا لایا۔ ہیروئن کی سہیلیاں اور سکھیاں بھی بُرقعوں میں ملبوس ہیں اور ویلن تک کے چہرے پر داڑھی اور آنکھوں میں سرمے کی تحریر ہے۔ گانے اس فلم میں نہیں ہیں۔ ہاں دو تین جگہ قوالی ضرور ہے۔ ہمارے دوست کو اُمید ہے کہ یہ فلم متدین طبقوں میں بہت مقبول ہو گی۔ رسالہ فاران کراچی۔ رسالہ تجلی دیوبند اور رسالہ ترجمان القرآن میں اس کا پے در پے اشتہار دیا جائے گا۔ اور مسجدوں کی دیواروں پر پوسٹر لگائے جائیں گے۔

رباعی سے رکابی تک

کیا مرد واقعی سست اور بے سلیقہ ہوتے ہیں؟ ہمارے اس سے اختلاف یا اتفاق رائے کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کیونکہ عمومی رائے یہی معلوم ہوتی ہے۔ اسی صفحے پر آپ ایک کارٹون دیکھیں گے۔ میاں نے لمبے ڈنڈے والے جھاڑو سے فرشوں کی صفائی کرنے کے بعد باورچی خانے میں بہت سی پلیٹیں دھو لی ہیں۔ لیکن ابھی کچھ باقی بھی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اس میں میاں نے کچھ زیادہ دیر لگا دی ہے۔ کیونکہ بی بی پہلے اپنے کمرے میں بیٹھی ریڈیو سنتی رہیں پھر ڈرائنگ روم میں رسالوں میں تصویریں دیکھتی رہیں۔ آخر اس سے بھی اکتا گئیں۔ کارٹون میں وہ میاں سے کہہ رہی ہیں "ذرا جلدی کام کیا کرو جی! میرا بھی کچھ خیال ہے؟ کتنی دیر سے اکیلی بیٹھی بور ہو رہی ہوں"۔

یہ مسئلہ بہت سے گھروں کا ہے۔ مرد لوگ گھر کی صفائی، چائے بنانے۔ برتن دھونے وغیرہ میں اتنی دیر لگا دیتے ہیں کہ بیویاں عاجز آ جاتی ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے۔ صبح کا وقت ہے۔ بیوی بستر میں پڑی ہیں، میاں چائے دانی بھر کر ان کے بستر کے پاس کی میز پہ رکھ تو گئے۔ لیکن پھر جا کر فرش رگڑنے لگے یا ناشتہ بنانے لگے۔ اتنا خیال نہیں کہ چائے بنا کر بھی دینی ہے۔ ادھر بیوی ایک ہاتھ سے اخبار تھامے اسے پڑھ رہی ہیں۔ دوسرے سے سر کھجا رہی ہیں۔ ان کا کوئی ہاتھ خالی ہوتا تو شاید خود بھی بنا لیتیں۔ میاں صاحب

ناشتہ بنا کر بچوں کو نہلانے اور کپڑے بدلنے میں جُٹ جائیں گے۔ اور پھر اپنے اور بیوی کے بوتے پالش کرنے کے بعد ان کو دفتر جانے کی جلدی پڑ جائے گی۔ شام کو آتے ہی باورچی خانے میں جا گھُسیں گے یا غسل خانے میں بیٹھ کر بچوں کے کپڑے دھوئیں گے۔ اس سے فارغ ہوتے تو کچھ سلائی کا کام لے بیٹھیں گے۔ قمیصوں کے بٹن ٹانک رہے ہیں۔ جرابیں رفو کر رہے ہیں۔ گلدان سجا رہے ہیں۔ گویا ہر چیز کا خیال ہے۔ نہیں خیال تو بیوی کا جو اپنے کمرے میں پڑی برابر ریڈیو سُن رہی ہیں یا معمے حل کر رہی ہیں اور بور ہو رہی ہیں۔ میاں سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ آ کر ان کے پاؤں ہی داب دے۔

ایک صاحبہ نے پچھلے دنوں ایک مضمون میں اس بات کی طرف توجہ دلائی تھی اور اشارۃً کہا تھا کہ مردوں کو خانہ داری کی تربیت حاصل کرنی چاہیئے۔ ان کا کہنا تھا کہ شوہر صاحب علی الصبح بیوی کو بستر ہی میں چائے کی ایک گرما گرم پیالی بنا کر دے دیا کریں۔ تو یہ معمولی سی بات باہمی محبت میں اضافے کا موجب ہو سکتی ہے۔ انہوں نے اس بات کا شکوہ بھی کیا کہ بہت سے مردوں کو سویٹر بننے نہیں آتے۔ حالانکہ یورپ میں چند صدی پیشتر یہ کام مرد ہی انجام دیا کرتے تھے۔ اس کے انہوں نے کئی فائدے بھی گنوائے تھے کہ سویٹر بننے سے سگریٹ پینے کی عادت چھوٹ جاتی ہے۔ وہ یوں کہ سگریٹ کا گُل جھاڑنے کے لئے ہر بار سلائیاں ہاتھ سے رکھنی پڑتی ہیں۔ اور یہ سلائیاں چلانا اتنا دلچسپ شغل ہے کہ چند دن کے بعد مرد سگریٹ پر لعنت بھیج دے گا۔ کہ اس سے سویٹر بننے کا مزا کرکرا ہوتا ہے۔

ہماری رائے میں مردوں کے لئے شروع ہی میں اس قسم کی تربیت کا بندوبست

ہو تو اچھا ہے۔ مثلاً ان کی تعلیم میں خانہ داری کا مضمون ضرور ہونا چاہیئے۔ اور اسکولوں
میں انہیں آٹا گوندھنا۔ روٹی پکانا۔ طرح طرح کے سالن تیار کرنا۔ بچوں کی نگہداشت
گھر کی صفائی وغیرہ سکھانے کا عملی انتظام ضرور ہو تاکہ شادی کے بعد گھر سنبھال سکیں۔ اس
زمانہ میں نہیں رہنا چاہیئے کہ پڑھ لکھ کے گریجویٹ ہو گئے ہیں اور برسر روزگار ہیں تو
لڑکیوں کے والدین ان کے گھر کے چکر کاٹنے شروع کر دیں گے۔ اب تو ضرورت رشتہ کے
اشتہار میں بھی یہ قید لگا دی جائے گی کہ لڑکا قبول صورت اور پابند صوم و صلوٰۃ ہونے
کے علاوہ گھرداری کا سلیقہ رکھتا ہو۔ سینا پرونا جانتا ہو۔ آٹھوں گانٹھ کمیت ہو۔ جہیز کی
کوئی قید نہیں۔ جتنا زیادہ لا سکے لے آئے۔ لڑکی کی والدہ جب لڑکے کو دیکھنے آئیں گی۔
تو لڑکے والے اس امر کا اہتمام کریں گے کہ اس وقت لڑکا حیا کی سرخی چہرے پر لئے
باورچی خانے میں بیٹھا آلو گوشت پکا رہا ہو اور آٹا گوندھ کے ایک طرف رکھ چھوڑا
ہو۔ لڑکے کی والدہ بہلانے بہلانے اپنی ہونے والی یا نہ ہونے والی سمدھن کو بتائے گی کہ یہ
ساری چادریں اور غلاف میرے بیٹے نے کاڑھ رکھے ہیں۔ اپنے کالج میں سلائی کڑھائی
میں ہمیشہ اوّل آتا رہا ہے۔ کھانا پکانے کی تربیت بھی ہم نے اچھی دلائی ہے۔ چھ مہینے تو
اس نے شہر کے مشہور مسلم کالی ہوٹل میں خانساماں کا کام کیا ہے۔ اور بیاہ شادیوں میں دیگیں
پکانے بھی جاتا رہا ہے۔ ادھر سمدھن اپنی بیٹی کے گن گائیں گی کہ بہت خلیق اور ملنسار لکھ
ہیں۔ اپنی صحت کا بہت خیال رکھتی ہیں۔ اس لئے سہیلیوں کو لئے اکثر باغوں کی سیر کرتی
رہتی ہیں۔ تصویریں بھی بناتی ہیں۔ آرٹ کونسل کی نمائش میں پہلا انعام انہی کو ملا وہ یوں
کہ انہوں نے طوطا بنایا تھا۔ کسی نے اسے گھوڑا بتایا۔ کسی نے درخت۔ کسی نے آٹا چھننے کی
چھلنی۔ صحیح کوئی نہ بتا سکا۔ فلم کوئی نہیں چھوڑی اور مطالعے کا ایسا شوق ہے کہ پاکستان کا کوئی
فلمی رسالہ نہیں جو نہ منگاتی ہوں۔ گاتی بھی ہیں۔ ٹکٹ جمع کرنے اور قلمی دوستی کا شوق ہے۔
ہم نے اس بات کی احتیاط رکھی ہے کہ کھانے پکانے اور صفائی دھلائی سے اس کے

ان اشغال میں ہرج نہ واقع ہو۔ یوں بھی ان کے آبا پرانی وضع کے ہیں۔ ان امور میں غور نفس کا عمل دخل پسند نہیں کرتے۔ اب میں مطمئن ہوں کہ جیسا بر میں چاہتی تھی۔ ویسا اللہ نے دے دیا۔

شاہی ممیرے کا فقیری سُرمہ

ایک صاحب روتے بسورتے نقش فریادی بنے ہمارے پاس آئے۔ ہاتھ میں ٹیلیویژن والوں کا ہدایت نامہ مشتہرین تھا۔ ہم نے کہا خیریت؟ بولے۔ آپ عوام کے ہمدرد ہونے کے مدعی ہیں۔ اک ذرا ہماری بھی دادرسی کیجئے۔ آخر ہم بھی تو عوام ہیں اور عوام ہی کی جیبیں کاٹ کر روٹی کھاتے ہیں۔"

ہم نے اپنی جیب کو ٹٹول کر اور اطمینان کر کے انہیں عزت سے بٹھایا اور پوچھا شکایت کیا ہے؟

بولے۔ میں ٹیلیویژن والوں کے ہاں ایک اشتہار دے کر گیا تھا۔ انہوں نے واپس کر دیا کہ اس سے مبالغے کی بو آتی ہے" ہمارے ہاں نہیں چلے گا۔"

"آپ بیچتے کیا ہیں؟" ہم نے کہا۔ "ذرا دیکھیں تو کون سا اشتہار ہے جو ان لوگوں نے واپس کر دیا۔"

انہوں نے ایک پرچی ہمیں دکھائی جس پر لکھا تھا۔

"اندھے پٹ پٹ دیکھنے لگے۔"

"کانے دو آنکھوں والے ہو گئے۔"

"شاہی ممیرے کے فقیری سرمے کی کرامات۔"

ہم نے کہا۔ "ہمیں تو اس اشتہار میں کوئی نقص نظر نہیں آتا۔ بہرحال اگر اس

ہیں کوئی مبالغہ ہے تو اسے نکال دیجیے نا۔

فرمانے لگے۔ "مبالغہ نکال کر اس میں رہے گا کیا؟۔ آپ نے سنا نہیں کہ سانچ کو آنچ ہے۔ اگر میں یہ انکشاف کردوں کہ اس سرمے میں ممیرہ نہیں۔ اور نہ مجھے معلوم ہے کہ ممیرہ کیا ہوتا ہے تو پھر مجھے آبائی پیشے کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ یعنی سائیکلوں کے پنکچر لگانے پڑیں گے۔

ہم نے ان کے ہاتھ سے ہدایت نامہ لے کر دیکھا واقعی پہلی شرط یہ تھی کہ اشتہار ایماندارانہ اور سچا ہو یعنی چھوٹتے ہی اشتہار بازی کے فلسفے کی بنیاد پر ضرب لگائی گئی تھی۔ اب ہم نے دوسری شرطوں پر نظر ڈالی۔ ایک یہ تھی کہ مردہ نشوئی اور گورکنی کے اشتہارات قابل قبول نہیں۔ کیوں قبول نہیں۔ اس کی کچھ وجہ بیان نہیں کی گئی۔ اکسیری گولیوں۔ فقیری ٹوٹکوں۔ طلسمی تعویذوں اور حکمی علاجوں پر بھی قدغن ہے حتیٰ کہ کوئی شخص مردے کو زندہ کرنے کا دعویٰ کرے تو ٹیلیویژن والے اس کی صحت پر شبہ کرکے اسے رد کر دیں گے۔ معموں اور جوئے کے اشتہار بھی نہ چاہئیں ضرورت رشتہ بھی مطلوب نہیں۔ جسم کو دبلا اور سڈول بنانے اور بیٹھے بیٹھے قد بڑھا دینے والی گولیوں کے اشتہار بھی ممنوع۔ سگریٹ کے اشتہار ضرور آسکتے ہیں۔ بشرطیکہ ان میں سگریٹ کی تعریف نہ کی گئی ہو۔ ایسے اشتہارات بھی جن میں بد ذوقی کا غل غپاڑہ ہو۔ کانوں کے پردے پھٹتے ہوں شکریے کے ساتھ واپس کر دیئے جاتے ہیں۔ وغیرہ

یہ شرطیں اس کتابچے میں لکھی ہوئی تو ضرور ہیں۔ لیکن ہماری دانست میں ٹیلیویژن کے شعبہ اشتہار والے جن میں بعض نامی گرامی اور اشتہاری ادیب شامل ہیں۔ اتنے سخت دل نہیں ہو سکتے۔ رعایت بھی برتتے ہوں گے۔ ٹیلیویژن والوں نے

تو مفت تحفے دینے والے ان اشتہاروں پر بھی پابندی عائد کر رکھی ہے۔ جن میں زور بجائے اصل چیز کے تحفے پر ہوتا ہے۔ اس سے یاد آیا کہ کوئی دو سال پہلے ہمارے شہر کے ڈرائی کلینرز میں تحفوں کی دوڑ ہوئی تھی۔ اگر کوئی شخص اپنی قمیض یا رومال بھی دھلاتا تھا تو اسے اپنی چیز اس وقت تک واپس نہ ملتی تھی۔ جب تک وہ ساتھ مفت کوئی تحفہ قبول نہ کرے۔ ایک ڈرائی کلینر نے تو یہاں تک اعلان کیا تھا کہ آیئے اور ہمارے ہاں کے تحفے لیجئے۔ کپڑے خواہ کسی اور جگہ سے دھلوایئے۔ ایک اور لانڈری والے نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور منادی کرائی کہ ہمارے ہاں سے تحفے لے جایئے۔ کم از کم پانچ روپے کے تحفے مفت قبول کرنے والے کو ایک سوٹ بھی مفت دھو کر دیا جائے گا۔

ہمارے نزدیک یہ پابندیاں ہماری ملکی ترقی کی راہ میں ناروا رکاوٹ ہیں۔ اگر کہیں ہمارے اخبارات بھی اس قسم کا ضابطہ سامنے رکھتے تو آج اکسیری گولیوں۔ جاپانی چھلّوں اور انگوٹھیوں، حبشیوں کو ایک دم گورا کرنے والے لوشنوں اور قد بڑھانے والی معجزاتی دواؤں کو یہ فروغ نہ حاصل ہوتا۔ نہ لوگوں کی بگڑی بنانے والوں اور بنی بگاڑنے والوں کے کاروبار میں اتنی برکت ہوتی۔ ہم ٹیلیویژن والوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا واقعی سانچ کو آنچ نہیں ہے!۔ اگر ان کے پاس واقعی سو فیصدی سچے اور ایماندارانہ اشتہار آنے شروع ہو گئے تو وہ انہیں دیں گے؟ مثلاً یہ

(۱)

ہماری بیش کش افلاطونی سگرٹ۔ ایک بار پیجئے۔ ہمیشہ کے لئے آپ اس کے ہو جائیں گے۔ کیونکہ یہ گلے میں خراش ڈالتا ہے جو مستقل کھانسی میں بدل جاتی ہے۔ اس میں تمباکو کے علاوہ اس کا نعم البدل گھوڑوں کی لید بھی شامل ہے۔ مسلسل

پینے والوں کو کینسر ہونے کی گارنٹی دی جاتی ہے۔ عوام کا من پسند افلاطونی سگرٹ۔

(۲)

سلیمانی چائے۔ نہایت خوبصورت نئے ڈبے ہیں۔ یاد رہے کہ صرف ڈبہ نیا ہے۔ اندر اس کے وہی استعمال شدہ پتی اور چنے کے چھلکوں کا مرکب ہے۔ آپ کے نفع نقصان سے ہمیں غرض نہیں۔ سلیمانی چائے پیجئے اور ہماری تجارت کو فروغ دیجئے۔

(۳)

فٹافٹ ڈرائی کلینرز۔ آیئے اور اپنے کپڑے ہمارے ہاں سے ڈرائی کلین کرایئے۔ ہم گاہکوں سے تو کچھ بھی کہیں۔ دراصل تمام کپڑے دھوبی گھاٹ کے تالاب میں ڈرائی کلین کرتے ہیں۔ ہمارے شوروم میں آپ کو جو مشین نظر آتی ہے وہ ڈرائی کلین کرنے کی نہیں۔ آئس کریم بنانے کی ہے۔ وہ بھی ناکارہ

اور آخر میں ہمارے ان کرمفرما کا یہ اشتہار ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف،

"شاہی نمیرے کا فقیری سرمہ۔ صاحبو۔ میں نہ ڈاکٹر ہوں نہ حکیم۔ سرمے کے بہانے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتا ہوں۔ اللہ کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ اس سرمے کا جزو اعظم واقعی دھول ہے۔ ہاں اس میں تھوڑا پیپر منٹ ملا دیا جاتا ہے۔ ہر شیشی پر ہمارا خرچ تو صرف پانچ پیسے آتا ہے لیکن چونکہ تھوڑا نفع لینا حرام ہے لہذا اپنے مہربانوں کے لئے قیمت ہے۔ تین روپے۔"

جھوٹ سچ کا ذکر برطرف۔ اشتہار ہماری کمزوری ہیں۔ اگر اسے ریڈیو اور ٹیلیویژن کے پروگراموں پر بالواسطہ رائے زنی نہ سمجھا جائے تو ہم عرض کریں کہ ہم ریڈیو اور ٹیلیویژن دیکھتے اور سنتے ہی ان کے لئے ہیں اور گوش نصیحت نیوش اور دیدۂ عبرت نگاہ کو کام

میں لاتے ہیں۔ پہلے ہمیں اشتہاروں کے لئے کسی آئٹم یعنی تقریر یا ڈرامے کے پورا ہونے کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ خوشی کی بات ہے کہ اب ہر آئٹم کے درمیان بھی کٹ کرکے اشتہار دیئے جانے لگے ہیں۔ رمضان کے فضائل پر مولانا بلیغ العلیٰ کی تقریر ہورہی ہے اور یک لخت مسلم ریستوران کا اشتہار نمودار ہوتا ہے "لذیذ کھانوں کے لئے مسلم ریستوان میں تشریف لایئے۔ رمضان کے دوران پردے کا بھی معقول انتظام ہے۔ آپ ہمارا اسپیشل رمضان لنچ گھر پر بھی منگوا سکتے ہیں۔"

اب تک خبروں میں یہ التزام نہ تھا۔ شروع سے آخر تک سوکھی خبریں سُننی پڑتی تھیں۔ بارے کل ہم نے یہاں بھی خبروں اور اشتہاروں کو تومن شدی من تو شدی دیکھا نیوز ریڈر کا چہرا نمودار ہوا۔

آج صدر جانسن نے اعلان کیا ہے کہ .... (خبر کٹ۔ اشتہار شروع)

"آپ کا محبوب ماماتا گھی اب دو پونڈ کے مہربند ڈبوں میں بھی دستیاب ہے۔ یاد رکھئے......"

"ہوائی جہاز صرف شمالی ویٹ نام کے سرحدی علاقوں پر بمباری کیا کریں گے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ وہ آیندہ صدارتی انتخابات میں کھڑے ہوں گے تو انہوں نے فرمایا......"

"امی بھی کھائیں۔ ابو بھی کھائیں۔ کھائیں دادا جان"

"جب صدر ڈیگال سے صدر جانسن کے اعلان پر تبصرہ کرنے کو کہا گیا تو وہ بولے"

"آپ عالم جی کے دھاگے استعمال کیجئے۔ میں ہمیشہ یہی استعمال کرتا ہوں۔"

ڈرامے میں بھی آپ دیکھیں گے کہ لق و دق جنگل ہے۔ ہیروئن لاچار بے یارو مددگار آرکسٹرا کی مغموم بیک گراونڈ دھن پر گلیسرین کے آٹھ آٹھ آنسو رو رہی ہے۔ یکایک سینے پر دوہتڑ مار کر گر جاتی ہے۔ "ہائے اللہ میں کیا کروں"؟

یکایک ایک صاحبہ کا چہرہ سولہ بلکہ بتیس سنگار میں نمودار ہوتا ہے۔

"بہن یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ ٹل ٹیکس کی چادریں خریدیے۔ کم خرچ۔ پائیدار اور رنگ پکّے۔"

ذکر حضرت مریض الملت کا

ہمارے مخدوم حضرت حفیظ جالندھری کا ایک سرٹیفکیٹ آج کل ایک چورن کے اشتہار کے ساتھ باقاعدگی سے چھپ رہا ہے۔ یہ ایک خط ہے جو انہوں نے اس چورن کے مُوجد حکیم صاحب کو لکھا ہو گا کہ "مکرمی، آپ نے جو ہاضمے کی گولیاں تیار کی ہیں۔ سبحان اللہ، مجھے ان سے بہت آرام ہے۔ براہ کرم ایک ڈبہ ان گولیوں کا اور بھیج دیجئے"۔

یہ کوئی نئی بات نہیں کہ ہمارے شاعر پہلے شاعری کرتے ہیں۔ پھر نثر سے مُنہ میٹھا کرتے ہیں۔ اور آخر میں تیر بہدف اکسیری دواؤں۔ جاذب معدہ چورنوں۔ بلادرد دانت اکھاڑنے والے منجنوں اور عینک توڑ سرموں کے سرٹیفکیٹ لکھتے ہیں۔ پہلی دو نوبتیں تو خیر ہم پر بھی آ چکی ہیں۔ تیسری کا انتظار ہے۔ حفیظ صاحب سے اگر ہمیں شکایت ہے تو یہ کہ ہم ان کے بہت قریب رہے ہیں۔ نہایت نیاز مند بلکہ فیضان کے لحاظ سے شاگردِ رشید۔ کئی بار ان سے درخواست کی کہ قبلہ ہماری شاعری کے متعلق کوئی سرٹیفکیٹ عنایت ہو۔ اس قسم کا کہ "میں نے حضرت ابن انشا کا کلام استعمال کیا۔ اس سے مجھے بہت افاقہ ہے۔ یہ چربی سے پاک ہے۔ اور وٹامن سے بھرپور"۔ چاہتے تو ہمارے نام خط بھی لکھ سکتے تھے کہ "مکرمی اپنے مجموعہ کلام کی دس جلدیں

وی، پی سے بھیج دیجیے۔ تاکہ بیٹھا پڑھتا رہوں۔ اور استفادہ کرتا رہوں"۔ اب صورت حال یہ ہے کہ ہماری اپنی سرکولیشن تو خاصی ہے' جگہ جگہ ہمارے مارے پھرتے ہیں۔ لیکن اس قسم کا سرٹیفکیٹ نہ ہونے کے باعث ہماری شاعری رہی جا رہی ہے۔ اور تو اور ریڈیو پاکستان والے تک جو ہر روز سائل جھنجھانوی اور گھائل گوروا سپوری کے سے شاعروں کی غزلیں گولتے ہیں، اور معیار کے بارے میں متعصب نہیں۔ ہمیں شاعر نہیں جانتے حفیظ صاحب سے مایوس ہو کر بلکہ انتقاماً کیجیے۔ حال ہی میں ہم نے ایک حکیم حاذق سے سرٹیفکیٹ حاصل کیا ہے کہ "ابن انشا صاحب کی شاعری نفخ کو نافع ہے۔ خون صالح پیدا کرتی ہے۔ اگر خالص گھی سونے کے کشتے سے بہتر ہے۔ تو انشا صاحب کی شاعری خالص گھی سے بھی بہتر ہے"۔ اس سند کے ساتھ ہم نے اپنا مجموعہ بجائے کتب فروشوں کے عطاروں اور دوا فروشوں کے ہاں رکھوا دیا ہے۔ بسوں میں بھی فروخت ہوتا ہے۔ جس بھائی کو ضرورت ہو آواز دے کر طلب کرلے۔

یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم چورن کی افادیت سے منکر ہیں یا اسے شاعری سے کم درجے کی چیز سمجھتے ہیں۔ جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے۔ یہ بھی ہم تسلیم کرتے ہیں۔ کہ چورن تبخیر کو دور کرتا ہے۔ جب کہ شاعری معدے میں تبخیر پیدا کرتی ہے۔ شاعر کے معدے میں شعر لکھنے کے فوراً بعد ایک باؤ گولا سا اٹھتا ہے۔ اور وہ سامعین کی تلاش میں اوم بوء آدم بو پکارتا بھٹکتا پھرتا ہے۔ کوئی اور سخن شناس نہ ملے تو کسی آتے جاتے پھیری والے یا ریڑھی والے ہی کو روک لیتا ہے۔ اور کلام عطا فرما کر اپنی تبخیر کو اس کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ جس علاقے میں شعر و شاعری کا زیادہ چرچا ہو وہاں فقط اسپرو ہی کی نہیں بلکہ سوڈا واٹر کی بوتلوں، کارمینا، مولی کے نمک اور ست کو والے پانوں کی کھپت خود بخود بڑھ جاتی ہے۔ ملال صرف یہ ہے کہ محض اس وجہ سے کہ ہم

شعر بناتے ہیں، چورن نہیں بناتے۔ ہم حفیظ صاحب کی نظروں میں بار نہ پا سکے۔ سُنا ہے علامہ اقبال مرحوم بھی ایسی ہی غیر فیاض طبیعت کے مالک تھے۔ ان کا ایک سرٹیفکیٹ ایک مرہم کے بارے میں تو کوئی چالیس برس سے چھپ رہا ہے کہ یہ چیز ناسور، بھگندر داد۔ خارش اور متعدی پھوڑے کا حکمی علاج ہے۔ لیکن کسی ہم عصر شاعر کے دل پر انہوں نے تعریف کا پھایا رکھا ہو۔ یہ ہمیں نہیں معلوم۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ہمارے حفیظ صاحب کو دواؤں سے بھی اتنا ہی شغف ہے، جتنا شاعری اور قوم کی خدمت سے۔ ہم پہلی بار ملے تو یہی سمجھے کہ کوئی خاندانی طبیب ہیں۔ دیکھا کہ فرش پر دری بچھی ہے۔ دری پر قالین بچھا ہے۔ قالین پر بستر بچھا ہے۔ اور بستر پر ہمارے حفیظ صاحب بچھے ہیں بلکہ بچھے جا رہے ہیں۔ قریب ایک الماری دھری ہے، کہ جب ذرا گردن اُٹھائی دیکھ لی۔ اس کے نیچے کے خانے میں شاعری کے بستے اور خام مال یعنی مضامینِ تازہ کے انبار اور قافیوں ردیفوں کے بقچے دھرے ہیں۔ اس سے اُوپر کے خانے میں معجونیں ہیں جوشاندے ہیں۔ عرق ہیں۔ شربت ہیں۔ اس سے اُوپر آئیے تو قطار در قطار ہومیوپیتھی کی گولیوں کی شیشیاں سجی ہیں۔ چوتھا خانہ انگریزی دواؤں کے لئے مخصوص ہے۔ گولیاں۔ پوڈر۔ کیپسول۔ انجکشن، تھرمامیٹر وغیرہ۔ سب سے اُوپر کا تختہ آیورویدک اور سنیاسیوں کی عطیہ دواؤں کے حصے میں آیا ہے۔ اس پر مختلف جڑی بوٹیاں، ایک کھرل۔ گھیکوار کا تازہ گچھا۔ نیم کی نمولیاں حتیٰ کہ ایک نیولا بھی پڑا ہے۔ معلوم نہیں مردہ ہے یا جان کے خوف سے دم سادھے بیٹھا ہے۔ کچھ واجبی سی گفتگو تو شاعری کے بارے میں ہوئی۔ اس کے بعد فرمایا۔ تمہارے چہرے پر زردی سی کیوں ہے۔ اختلاج تو نہیں ہوتا۔ کنپٹیاں تو درد نہیں کرتیں۔ اور دن کو تارے تو نظر نہیں آتے؟ ہم نے قبول دیا کہ یہ آخری علامت درست ہے۔ فرمایا۔ کل اپنی غزلوں کا دیوان اور قارورہ لے کر آنا اور آج کے لئے یہ نسخہ نوٹ کر لو۔ سلفا ڈائزین۔ نکس وامیکا اور

مصطگی رومی ایک ایک تولہ لے کر گھیکوار کے رس میں کھرل کرو اور پھر خمیرہ گاؤزبان میں رکھ، ورق نقرہ پیچیدہ، شربت دینار کے ادّھے کے ساتھ نوش جان کر جاؤ۔"

ہم نے کہا "شربت دیدار؟ یہ کہاں سے ملے گا۔؟"

بولے "شربت دیدار نہیں بے وقوف۔ شربت دینار۔"

ڈاکٹر اقبال ڈاکٹر تو تھے ہی۔ خواہ نام ہی کے تھے۔ کیونکہ انجکشن وہ نہ لگا سکیں لیکچر وہ نہ دے سکیں۔ اور فیس وہ نہ لے سکیں۔ اس پر عقیدت مندوں نے انہیں حکیم الامت کا لقب بھی دے دیا۔ وہ آخری عمر تک حکیموں کے زیر علاج ضرور رہے اور یہ سچ ہے کہ انہی کے ہاتھوں مرے لیکن خود طبابت کبھی کی ہو، یہ کسی کتاب سے ثابت نہیں۔ اس کے مقابلے میں حفیظ صاحب کو کہ ان کی ساری عمر بیماریوں اور دواؤں کے دشت کی سیاحی میں گزری ہے۔ لوگوں نے فردوسی اسلام، شاعر پاکستان حتیٰ کہ خان بہادر تک کہا۔ لیکن حکیم قسم کے خطاب سے محروم رکھا۔ ابوالاثر کے لقب میں بے شک ایک اشارہ سا ہے کہ ان کی دواؤں میں اثر ہوگا اور ان کے ہاتھ میں شفا ہو گی۔ لیکن ایسے شخص کے لئے یہ کافی نہیں جس کی جو سانس آتی ہے اور جاتی ہے، اپنے اور قوم کے لئے نسخے لکھنے اور دوا دارو کرنے کے لئے وقف ہے۔ آخر خود انہوں نے مریض الملک کا لقب اپنے لئے پسند کیا۔ اور ہم نے طبیب القوم کی اعزازی ڈگری انہیں پیش کی۔

حفیظ صاحب میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ اتنے بڑے ماہر طب یعنی بیک وقت وید۔ حکیم۔ ڈاکٹر۔ ہومیو پیتھ عامل کامل ہونے کے باوجود مریضوں کے محتاج نہیں۔ پیشہ ور حکیموں کو ہم نے دیکھا ہے کہ بیٹھے لوگوں کا انتظار کرتے رہتے ہیں کہ کب کوئی آئے اور وہ اس کے حلق میں کوئی جوشاندہ یا خیساندہ مع دوا کے بل کے اتار دیں۔ لیکن حفیظ صاحب نے کہ ہمیشہ سے بے ہمہ و با ہمہ، خوددار اور خود کفیل واقع ہوتے ہیں

نہ کبھی کسی کا رستہ دیکھا نہ کسی کے بیمار ہونے کی دعا مانگی۔ انہوں نے اپنی ذات ہی میں وہ ساری بیماریاں پیدا کر رکھی ہیں، یا ڈھونڈ رکھی ہیں۔ جن کا کتابوں میں ذکر آیا ہے یا آنا باقی ہے جس طرح وہ خدمت برائے خدمت اور ادب برائے ادب کے قائل ہیں۔ اسی طرح دوا برائے دوا بھی ان کا اصول معلوم ہوتا ہے۔ خود ان دواؤں کو بھی جو وہ نوش جاں کرتے ہیں۔ بعض اوقات پتہ نہیں چلتا کہ وہ کس مرض کی دوا ہیں۔ پانی کے ایک گھونٹ کے ساتھ کوئی کیپسول نیچے چلا جا رہا ہے۔ دوسرے کے ساتھ چمچہ بھر خمیرہ جواہر والا اس کا تعاقب کرتا ہے۔ تیسرے کے ساتھ کوئی فقیری ٹوٹکا یا کشتہ ہے۔ اس کے اوپر سے ہومیو پیتھی کی گولیوں کا ایک پھنکا بھی مارا ہے۔ سامنے شربت بزوری کی بوتل دھری ہے کہ آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند۔ اسپغول کی دھونی بھی لے رہے ہیں۔ اور کمپونڈر بھی کسی انجکشن کی پچکاری لئے اشارے کا منتظر ہے۔ پھر دوا ہی پر بس نہیں۔ دعا بھی ہو رہی ہے۔ اپنی جان شیریں پوری طرح حکیموں، ڈاکٹروں اور خود اپنے دست شفا کو ہبہ نہیں کر دی۔ بلکہ کچھ شافی حقیقی کے لئے بھی چھوڑ دیا ہے۔ بہر حال ہماری دعا ہے کہ انہیں اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست۔ یہ یونہی زندہ رہیں اور تالیف نسخہ ہائے وفا کرتے رہیں۔ کیونکہ ہم تو انہی کے مریض ہیں۔ ان کی شاعری کے مریض۔ ان کی محبت کے مریض۔ معمولی مریض نہیں بلکہ۔ کہنہ مریض۔ مایوس العلاج مریض۔

فلم مائی کالال سنسر ہوتی ہے

پچھلے دنوں فلم سنسر بورڈ نیا بنا ہے اور اچھا بنا ہے۔ اس میں کچھ علما بھی شامل ہیں جن کو ویسے کبھی فلم دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہ پہلی بار یہ دیکھ کر حیران بھی ہوئے کہ تصویریں بھی چلتی پھرتی اور بولتی ہیں۔ آخر ہمارے ملک میں ایک بڑی آبادی ہے جو فلم نہیں دیکھتی، ان کی نمائندگی بھی ضروری تھی۔ پھر بہت سے لوگ ایسے ہیں جو فلم دیکھتے ہیں لیکن اس کی سمجھ نہیں رکھتے۔ ان کی نمائندگی کے لئے ایسے لوگ بھی سنسر بورڈ میں رکھے گئے ہیں تاکہ اس کی ہیئت زیادہ سے زیادہ جمہوری ہو جائے۔ اب بظاہر کسی کو شکایت کا موقع نہ ہونا چاہیئے۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ اب بھی کچھ لوگ اس کی تشکیل سے مطمئن نہیں۔ ان میں ایک تو خیر ہم خود ہیں۔ دوسرے راولپنڈی کے ایک حکیم صاحب ہیں جنہوں نے مطالبہ کیا ہے کہ ایک حکیم کو بھی سنسر بورڈ میں شامل کرنا چاہیئے۔ کیونکہ فلموں میں حکیم کا کردار بڑے قابلِ اعتراض انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ بڈھا، بیوقوف شکی وغیرہ۔ سنسر بورڈ میں کوئی حکیم ہوگا تو اس قسم کی شرارت کا تدارک کر سکے گا۔

حکیم صاحب نے تدارک کا اچھا نسخہ بتایا ہے یعنی سنسر بورڈ میں ایک حکیم ضرور ہونا چاہیئے۔ لیکن ٹھہریئے۔ حکیم ہے تو ایک ڈاکٹر بھی چاہیئے۔ ورنہ تو فلم والے اپنی فلموں میں ڈاکٹر موٹو قسم کے کردار بھر دیں گے۔ اب ہومیو پیتھی بھی تسلیم ہے۔ لہذا ایک

ہومیو پیتھ کو بھی بکس وامیکا کی شیشی لئے سنسر بورڈ میں موجود رہنا چاہیئے۔ ہم تو کہتے ہیں کہ ایک سلوتری بھی ہو تو عین مناسب ہے۔ آخر فلموں میں انسان نہیں جانور اور مویشی بھی تو دکھلاتے جاتے ہیں۔ دوسرے اہل حرفہ بھی نمائندگی کے مستحق ہیں۔ ایک بار خاکروبوں کو شکایت پیدا ہوئی تھی کہ فلمیں صاف ستھری نہیں بنتیں۔ لانڈری والوں نے بھی مطالبہ کیا تھا کہ ہماری فلمیں بے داغ ہونی چاہئیں۔ نمائش سے پہلے ہمیں دی جائیں تاکہ ہم انہیں ڈرائی کلین کر دیں۔ جاٹ حضرات بھی ایک فلم کا نام بدلوا چکے ہیں۔ وہ جو جیٹی تھی آخر جیٹی بن کر ریلیز ہوئی۔ آئندہ بھی غلطی کا احتمال ہے۔ لہٰذا لازم ہے کہ ایک جاٹ بھی سنسر کے وقت کھاٹ ڈالے سنسر بورڈ میں مستقل بیٹھا ہو۔ جہاں کوئی بات خلاف مزاج پائی۔ وہیں اس نے فلم پروڈیوسر کے دھول جمائی۔

باربر حضرات کی یونین چونکہ زیادہ مضبوط ہے اس لئے وہ اپنے حقوق کے بارے میں زیادہ خبردار رہتے ہیں۔ وہ کئی بار شکایت کر چکے ہیں کہ فلمساز ان کے اچھے خاصے پیشے کی محض اپنی تفریح طبع کے لئے حجامت کر دیتے ہیں لہٰذا آدمی کوئی ان کا بھی دم تحریر ہونا چاہیئے یعنی سنسر بورڈ کے اندر۔ جہاں کسی سین میں بال برابر بات قابلِ اعتراض نظر آئی۔ انہوں نے قینچی چلائی۔ یاد رہے کہ کسی باربر کو رکن بنانے میں سنسر بورڈ کا خرچ بھی بچے گا۔ اس کے لئے قینچی خریدنی نہیں پڑے گی۔ اس کے اپنے پاس ہوتی ہے۔ ہمارے ان بھائیوں کی جو کسی فلموں تک محدود نہیں۔ اردو کی کسی درسی کتاب میں کسی شاعر یا قافیہ پیمائی نے لکھ دیا تھا۔ "نائی آیا ہے۔ چارپائی لایا ہے"۔ اسلام سلمانی صاحب نے فوراً اعتراض کیا کہ چارپائی لانا نائی کا کام نہیں۔ ٹیکسٹ بک بورڈ والوں کو یہ فقرہ خارج کرتے ہی بنی۔ اس کی بجائے غالباً یہ فقرہ رکھوایا گیا۔ "ہیر ڈریسر آیا ہے، سیفٹی ریزر لایا ہے"۔

پس ہم فرض کر لیتے ہیں کہ ایک وقت آتا ہے۔ جب کہ سب طبقوں کی نمائندگی سنسر بورڈ میں ہو جاتی ہے تاکہ فلم پر کسی کو اعتراض نہ رہے جیسے فلم "مانی کا لال" عرف "طوفانِ محبت" سنسر ہونے کے لئے تیار ہے۔ ہال بھرا پڑا ہے۔ یہ دو ڈھائی سو آدمی تماشائی نہیں بلکہ سب فلم سنسر بورڈ کے ممبر ہیں۔ ادھر ایک وکیل صاحب ہیں۔ ایک منشی جی بھی کان پر قلم رکھے تشریف فرما ہیں۔ ایک تھانیدار بھی ہتھکڑی لئے موجود ہے۔ ایک پٹواری بھی اپنے بستے سے ٹیک لگائے منتظر ہے۔ ایک سیٹھ صاحب ہیں۔ ایک سود خور کابلی بھی سائیکل لئے موجود ہے۔ حتیٰ کہ ایک طرف افیمچیوں کا نمائندہ بھی افیم کی طشتری لئے اور گنڈیریاں رومال میں باندھے بیٹھا ہے، کیونکہ فلم والوں کا اور کوئی نہیں ملتا تو انہی کا مذاق اڑا دیتے ہیں اب کے کسی فلمساز نے ایسی حرکت کی تو دیکھئے گا۔ ادھر کوئی ایسا ویسا سین سکرین پر آیا۔ ادھر اگر یہ اس وقت پینک میں نہ ہوتے۔ انہوں نے فلمساز کے تر ولی بھونک دی ہی کہیں کا۔ ٹھہر تو سہی۔

اچھا اب باتیں بند، کیونکہ فلم شروع ہو گئی ہے، دیکھئے لڑکی یعنی ہیروئن اٹھلاتی ہوئی پانی بھرن کو چلی۔ پانی بھرن کا تو بہانہ ہے آج کل دیہات میں بھی نلکے لگے ہوئے ہیں مقصود اس کا ہیرو کو منہ دکھانا ہے۔ یک لخت آواز آتی ہے "ٹھہرو۔ روکو فلم۔ یہ فلم نہیں چل سکتی"۔ بتی جلا کر دیکھتے ہیں کہ ایک صاحب گل مچھوں والے کھیس کی بکل مارے گھونسا تانے کھڑے ہیں اور بکار رہے ہیں: "کس بدذات نے بنائی ہے یہ فلم"۔ یہ صاحب والدین کے نمائندے ہیں اور فرما رہے ہیں: "ارے ہماری لڑکیاں ایسی سبقی ہیں؟ اجنبیوں سے چھپ چھپ کر ملتی ہیں۔ ارے کچھ حیا شرم کرو۔ کیا تمہاری بہو بیٹیاں نہیں ہیں؟" فلمساز وعدہ کرتا ہے کہ جی اچھا یہ سین میں نکال دوں گا۔ اصلاح کر دوں گا۔ فلم آگے چلتی ہے۔ لنگرا ولن ہیروئن پر دست درازی کرنا چاہتا ہے۔ وہ عفت کی پتلی وار خالی دیتی ہے بلکہ اس کا کتا ولن

کا ماتم کر لیتا ہے۔ ولن سے کچھ اور تو ہوتا نہیں۔ کھسیانا ہو کر ایک ڈنڈا کتے کے رسید کرتا ہے۔ چیاؤں چیاؤں، چیاؤں۔

یک لخت ہال میں ایک کورٹ کا ملبند ہوتا ہے۔ 'بلّے بلّے، بلّے، بلّے بلّے'، لائٹ جلا کر دیکھا۔ یہ ولنوں کے نمائندے تھے۔ جن کو ایک زمانے سے شکایت تھی کہ فلموں میں ولن کا کردار اچھے معنوں میں نہیں پیش کیا جاتا۔ نمائندے صاحب نے الٹا ہاتھ منہ پر رکھ کر بجا بلایا اور للکارا ——" او کڈھو فلمسازنوں کہندے آ۔ میں اوہدی لت بھن دیاں گا۔ میں ایسی فلم نوں اگ لگا دیاں گا" بڑی مشکل سے ان کو ٹھنڈا کیا جاتا ہے۔ اعتراض ان کا ٹھیک ہے۔ ہماری فلموں میں ولن کو عموماً بدمعاش یا غنڈہ دکھایا جاتا ہے۔ اکثر تو اسے ہیرو کے ہاتھوں مار کھاتے بھی دکھاتے ہیں جو دل آزار ہونے کے علاوہ خلاف حقیقت بھی ہے۔ کیونکہ اصل زندگی میں عموماً ہیرو مار کھاتا ہے۔ ولنوں کے نمائندے کو یہ بھی اعتراض ہوا کہ فلم میں ہیروئن کی شادی ہمیشہ ہیرو کے ساتھ کی جاتی ہے حالانکہ ولن کے ساتھ ہونی چاہیے۔ جیسا کہ اصل زندگی میں ہوتا ہے پھر کسی شخص کو عین نکاح کے وقت رنگ میں بھنگ ڈالنے کی اجازت بھی نہ دینی چاہیئے کہ ٹھہرو، یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ کیوں بھئی کیوں نہیں ہو سکتی؟ ہیرو میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔ جب ہیرو کے ساتھ نکاح ہو سکتا ہے تو ولن کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ بھی تو انسان ہے۔ وہ بھی تو مسلمان ہے ——؟

ولن نمائندے کا اعتراض بھی نوٹ کیا جاتا ہے۔ معقول بات سے کون اختلاف کر سکتا ہے۔ اب فلم آگے چلتی ہے۔ لیکن نہیں۔ اتنے میں دوسری طرف سے ایک صاحب ہاتھ کھڑا کرتے ہیں کہ ٹھہریئے۔ نام پتہ لکھایئے؟ آپ کون؟ میں محکمہ انسداد بے رحمی حیوانات

کا نمائندہ ہوں جناب۔ آپ لوگوں نے کیا سمجھ کر اس معصوم کتے کے لاٹھی جمائی۔ لکھوائیے پروڈیوسر صاحب اپنا نام پتہ ولدیت۔ سکونت، آخر پروڈیوسر یہ وعدہ کر کے چھوٹتا ہے کہ یہ سین بھی نکال دیا جائے گا۔ سیٹھوں کا نمائندہ وہ تمام فقرے اور سین نکلوا دیتا ہے۔ جن میں پیسے والوں پر طنز کا پہلو ہے کیونکہ ساری خرابیاں طبقاتی شعور ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ جیب کتروں کا نمائندہ اس سین پر اعتراض کرتا ہے جس میں ہیرو کی جیب کٹ جاتی ہے۔ اس کا اعتراض بھی بجا ہے۔ اس قسم کے مناظر سے ایک خاصے بڑے طبقے یعنی جیب کتروں کے متعلق لوگوں کے دلوں میں عداوت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ فلم پروڈیوسر یہ اعتراض نوٹ کرنے کے لئے جیب کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے تو اپنا پارکر پین غائب پاتا ہے۔ جیب کتروں کا نمائندہ پین اس کو واپس کرتے ہوئے کہتا ہے۔ اب تو ثبوت مل گیا نہ کہ جیب کترے بھی شریف آدمی ہوتے ہیں۔

ان مراحل سے گذر کر ہم فلم کے آخری سین پر آتے ہیں اور سنسر بورڈ یہ حکم دینے کو تیار ہوتا ہے کہ یہ جو چند مناظر ندی نالوں اور رچوپال کی گپ شپ اور دلہن کے سولہ سنگار وغیرہ کے بلا اعتراض رہ گئے ہیں۔ ان کو پاس کیا جاتا ہے کہ اتنے میں ایک صاحب آنکھوں میں لمپ لمپ سُرمہ کاندھے پر رومال پہلے ہاتھ کھڑا کرتے ہیں۔ پھر خود اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں "حضرات میں ہوں انجمن اصلاح اخلاق کا نمائندہ۔ میں فلم بنانے کے کاروبار کو سراسر خلافِ شرع سمجھتا ہوں۔ بند کیجئے فلم اور فلمساز دونوں کو ڈبے میں۔" کیا یہ ملک اس لئے بنایا گیا تھا کہ یہاں فلمیں بنیں؟

اخبار کل کے اور آج کے

ہمارے مہربانوں میں ایک بزرگ ہیں پرانے خیال کے۔ وقتاً فوقتاً آکر ہمیں قربِ قیامت کی بشارت دیتے رہتے ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی تو قیامت کی تاریخ بھی ڈال جاتے ہیں۔ ہمیں زندگی کا بیمہ کرانے سے بھی انہی نے باز رکھا ہے فرماتے ہیں کہ پریمیم کی قسطیں ڈوب جائیں گی۔ کیونکہ پالیسی کی میعاد ختم ہونے سے پہلے قیامت کا آنا یقینی ہے اور محشر کے اتنے بڑے میدان میں آپ کمپنی والوں کو کہاں تلاش کرتے پھریں گے کہ لاؤ میرے پیسے۔ اُن کی مقرر کردہ قیامت کی تاریخ ٹل جاتی ہے تو فرماتے ہیں کہ کسی نیک آدمی کے اعمال آڑے آگئے۔ لیکن۔ یہ بات کچھ ایسے ناگوار لہجے میں کہتے ہیں جیسے "نیک" سے ان کا مطلب نابکار، آدمی سے ہو۔ ہمیں زبانِ حال سے وہ ہمیشہ یہی کہتے نظر آتے کہ قیامت کو آنا ہے تو ہمارے جیتے جی آتے، ہمارے بعد آئی تو کیا آئی۔ اُن کا بس نہیں چلتا ورنہ خود ہی اٹھا کر صور پھونک دیں۔

قیامت آنے کی جتنی نشانیاں پہلوں نے مقرر کی ہیں۔ ہمارے ان بزرگ کے نزدیک نہ صرف وہ سب کی سب پوری ہو چکی ہیں۔ بلکہ اتنی کچھ فالتو وجوہات بھی جمع ہو گئی ہیں کہ شاید ایک قیامت میں پورا نہ پڑے۔ اُن کے نمٹانے کے لئے دو تین آئیں۔ ان کی ذاتی رائے تو اس سے بھی آگے کی ہے وہ یہ کہ ہر دوپٹے کے پیچھے جو سر سے سرکتا

ہے۔ اور ہر چولی کے لئے جو اونچی ہوتی ہے۔ ایک سالم قیامت کا آنا واجب ہو جاتا ہے۔ خیر دوپٹوں اور چولیوں کے قیامت ڈھانے کی بات تو ہماری سمجھ میں آتی ہے۔ بلکہ کئی بار تو کسی بت کافر کو قیامت خیزی کے عالم میں دیکھ کر رحم بھی آیا اور یہ خیال بھی کہ اسے اپنے دستِ حق پرست پر مسلمان کیجیے اور اس کی عاقبت سنوار دیجے۔ لیکن پھر دیکھا کہ یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔ اکثر تو تبلیغ شروع کرنے کے پہلے دوسرے روز ہی ہمارا اپنا ایمان متزلزل ہونا شروع ہو جاتا ہے اور قشقہ لگا کر دیر میں بیٹھنے کو جی چاہتا ہے۔

بے حیائی اور بے مروتی، جھوٹ بولنا اور لپاڑنا تو لنا وغیرہ وجہیں پرانی ہوتی دیکھ کر ہمارے ان مہربان نے قیامت کو جلد تر وقوع میں لانے کے اور بہانے ڈھونڈنے شروع کر دیتے ہیں۔ ابھی کل ہی ہمارے پاس تشریف لائے اور بولے" ہائے۔ ہائے اخبار والوں نے اردو کا کیا ستیا ناس کیا ہے۔ مقفیٰ اور مسجع عبارتوں کی تو ان لوگوں کو کیا توفیق سیدھی سیدھی عبارت میں بھی املا غلط، انشا غلط، اخبار پڑھو تو یوں لگتا ہے جیسے مسلسل منڈیوں کے بھاؤ پڑھے جا رہے ہیں۔ ہمیں خدا نے زبان کا یہ حشر ہوتے دیکھنے سے پہلے کیوں نہ اُٹھا لیا۔ پھر اپنے محبوب موضوع کی طرف آتے ہوتے بولے۔ یہ قیامت بھی کم بخت نہیں آ پاتی۔ خیر اب تو اسے آنا ہی پڑے گا۔ بھلا یہ اردو ہے؟ فلاں نے فلاں کو چیلنج کر دیا۔ رٹ فائل کر دی۔ کورم ٹوٹ گیا۔ اخبار کی عبارت تو ایسی ہونی چاہیئے کہ پڑھنے والا طلسم ہوشربا کی طرح پڑھتا جائے ہاتھ سے رکھنے کو جی نہ چاہے۔

ہم نے جان کی اماں پا کر عرض کیا کہ جیسی عبارتیں آپ فرماتے ہیں وہ فسانۂ

عجائب، قصہ گل با صنوبر وغیرہ ہی میں چھپتی ہیں اخبار میں تو مرنے مارنے۔ لپا ڈگی وغیرہ کی خبریں ہوتی ہیں) یا پھر اقتصادی تبصرے۔ یعنی آٹے دال کا احوال آجاتا ہے۔ اس پر انہوں نے فوراً ہمارا قطع کلام کر کے اپنے تھیلے میں سے ایک بوسیدہ پرچہ نکالا اور فرمایا۔ دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا۔ بات اس میں بھی آٹے دال کی ہے۔ لیکن سبحان اللہ کیا سلیقہ ہے۔

ہم نے کہا "کیا چیز ہے یہ۔ کوئی داستان ہے؟" فرمایا "داستان نہیں۔ اخبار ہے۔ پچھلی صدی میں لکھنؤ سے نکلتا تھا۔ سحر سامری نام تھا اور ایڈیٹر تھے اس کے لالہ گھبر نرائن عیاش"۔

"پڑھئے"۔ ہم نے بیچارگی سے کہا۔

"سنیئے" وہ بولے۔ "ان دنوں غلہ کی گرانی ہے۔ گرانیٔ خاطر کی فراوانی ہے۔ اس قدر مہنگا اناج ہے۔ آسیائے فلک بھی دانے کو محتاج ہے۔ فاقہ کشوں کی برقِ آہِ شرربار سے خرمنِ ماہ جل گیا۔ گروہ نانِ خورشید غم کے پاؤں کے نیچے کچل گیا۔ بے تماشی نے ہر تماش کے آدمی کا اطمینان کھو دیا۔ جس نادان و دانا نے حالِ بربادی سُنا رو دیا۔ ایک تو معاش نہیں، جائے تلاش نہیں۔ دوسرے وفورِ غم سے گندمی رنگ ہر بشر کا نیلا ہوا۔ گویا مفلسی میں آٹا گیلا ہوا۔ ۔ ۔ ۔ خونِ دل بجائے شراب ہے۔ لختِ جگر کباب ہے۔ چکنی چپڑی باتوں سے تدبیر نہیں چلتی۔ بہت سر ٹپکتے ہیں۔ دال نہیں گلتی۔ سالکِ اس طرف عنانِ توجہ موڑتا نہیں۔ بس کیا کریں اکیلا چنا بھاڑ پھوڑتا نہیں"۔

ہم نے کہا۔ بس بس۔ آپ کا مطلب ہم سمجھ گئے۔ فرمایا "آپ نے دیکھا نہیں۔ آسیائے فلک، نادان و دانا۔ گندمی رنگ۔ اکیلا چنا۔ اس میں کتنی رعایتیں آگئی ہیں۔ انسان گڑ نہ دے، گڑ کی سی بات تو کرے۔

ہمیں معلوم نہیں یہ اخبار روزانہ تھا یا ہفتہ وار یا مرضی وار یعنی جب ایڈیٹر کی مرضی ہوتی ہو نکال دیا۔ ہمارے تصور میں اس اخبار کے دفتر کا نقشہ کچھ یوں آتا ہے کہ دو تین بزرگ چوکی بچھائے کاغذ کے تاؤ سامنے رکھے بیٹھے ہیں۔ افیم کی پیالیاں پاس پڑی ہیں۔ ایک طرف برفی کا دونا۔ گنڈیریوں کا چھیبا دھرا ہے۔ اور چپراسی نے ابھی ابھی حقّے پر چلم لاکر رکھی ہے۔

ایڈیٹر صاحب پوچھتے ہیں "۔ اماں کتنا ہو گیا۔ کیا خبر دے رہے ہیں"۔

سب ایڈیٹر صاحب "۔ حضنت وہی آٹے دال کی گرانی والی خبر ہے"

ایڈیٹر:۔ "کہاں سے لی تھی یہ خبر"؟

سب ایڈیٹر:۔ "ابھی ابھی چنڈو خانے سے سُن کے آیا ہوں۔ بہت معتبر ہے"۔ ..

ایڈیٹر:۔ "اور کیا کیا مواد ہے اس پرچے ہیں"

سب ایڈیٹر:۔ "حضور غزلیں ہیں۔ فیض آباد والے مشاعرے کی۔ ایک داستان ہے جو مسلسل چل رہی ہے اپنے مرزا افغن کی۔ طلسم حیرت کشا۔ ابھی دو سال اور چلے گی انشاء اللہ"۔

ایڈیٹر:۔ "ایڈیٹوریل کس چیز پر لکھیں"۔

سب ایڈیٹر:۔ "اب کے ایطائے جلی پر لکھئے۔ آپ کے حریف ہیں۔ نہ میر مجنوں، ان کے شاگردوں کے ہاں آج کل ایطائے جلی کی بھرمار ہے۔ بلکہ اب کے تو ایڈیٹوریل پورا منظوم ہونا چاہیئے"۔

ایڈیٹر:۔ "نہیں۔ نہیں۔ یہ نیا زمانہ ہے۔ روم اور روس میں سُنا ہے لڑائی ہو رہی ہے۔ انشاء اللہ ایسا ایڈیٹوریل لکھتا ہوں کہ روس کے چھکّے چھوٹ جائیں"۔

سب ایڈیٹر:۔ "ہاں۔ ہاں۔ سبحان اللہ۔ اب کے پرچہ کس تاریخ کو نکالنے کا ارادہ ہے"۔

ایڈیٹر:۔ "جب چاہیں گے لگالیں گے۔ ہم ایڈیٹر ہیں۔ خریداروں کے باپ کے نوکر تھوڑا ہی ہیں۔"

پچھلی صدی کے اخبار بے شک اُردو میں نہیں۔ اُردو سے معلّٰے میں ہوتے تھے۔ نئے زمانے کی آپا دھاپی نے زبان کا لطف غارت کر دیا۔ اُس زمانے میں سُنی سُنائی خبروں اور چنڈو خانے کی گفتگو اخبار بھرنے کے لئے بہت تھی۔ اب ادھر تار آرہے ہیں۔ ٹیلی پرنٹر کھٹا کھٹ چل رہا ہے۔ اور فون کی گھنٹی بج رہی ہے۔ خبروں کا پشتارہ ہوتا ہے۔ جو سمیٹے نہیں سمٹتا۔ پُرانے دفتروں کا ماحول بھی بہت پُرسکون ہوتا تھا۔ کاتب بیٹھا لکھ رہا ہے۔ ایڈیٹر کو آواز دی۔ "حضور پاؤ کالم رہ گیا ہے۔ اس کے لئے میٹر دے دیجئے۔"

ایڈیٹر پکارتا ہے۔ "لکھو۔ آج چوک میں دو تانگوں کی ٹکر ہو گئی۔ تین آدمی زخمی ہو گئے ایک کی حالت خراب ہے۔ آگے خود بڑھا لو۔"

تھوڑی دیر بعد کاتب پھر پکارتا ہے۔ "جناب۔ دو تین سطریں پھر بھی خالی بچتی ہیں۔"

ایڈیٹر صاحب فرماتے ہیں۔ "اچھا! ان میں اس خبر کی تردید دے دو کہ ہم نے تحقیق کی۔ یہ خبر سراسر غلط ثابت ہوئی۔"

اُس زمانے کے خریداروں اور پڑھنے والوں کو بھی اللہ نے بہت فرصت دی تھی۔ ایک خبر کو بار بار پڑھتے تھے۔ سارا اخبار اوپر کی سُرخی سے پرنٹ لائن تک چاٹ جاتے تھے اور زبان و بیان قافیہ ردیف کی خوبیوں پر سر دھنتے تھے۔ ان کے لئے آٹے کی مہنگائی بجائے خود کوئی خبر نہ ہوتی تھی۔ یہ دیکھنا ہوتا تھا کہ لکھنے والے نے اس میں

تلازموں اور عبارت آرائی سے کیا رنگ پیدا کیا ہے۔ آج کل تو خبریں ہی اتنی ہوتی ہیں کہ ان کے خلاصے کرنے پڑتے ہیں۔ یہ اُوپر کی خبر زیادہ سے زیادہ اتنی رہ جاتے گی۔ "آٹا مہنگا ہو گیا لوگ پریشان ہیں"۔ بلکہ اتنی بھی نہیں۔ "آٹا مہنگا ہو گیا ہے" کافی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ لوگ آٹا مہنگا ہونے سے پریشان ہوا کرتے ہیں۔ آگے چل کر مزید اختصار کرنا پڑے گا۔ محض "آٹا" لکھ دینا کافی ہو گا کیونکہ مہنگائی کا سبھی کو علم ہوتا ہے۔ آپ نے اس دکاندار کا قصہ سُنا ہو گا۔ جس نے اپنی دکان پر لکھوا رکھا تھا۔ "یہاں تازہ مچھلی فروخت ہوتی ہے"۔ ایک صاحب نے کہا۔ "یہاں" کا لفظ زائد ہے۔ سبھی کو معلوم ہے کہ مچھلی یہاں فروخت ہوتی ہے۔ کہیں اور نہیں۔ دکاندار نے یہاں مٹا دیا۔ ایک دوسرے منطقی آتے۔ بولے "فروخت ہوتی ہے"۔ زائد ہے۔ سب جانتے ہیں کہ دکانوں پر مچھلی فروخت ہوا کرتی ہے۔ خریدی نہیں جاتی۔ ان کے تعمیل ارشاد میں فقط "تازہ مچھلی" کے الفاظ رہ گئے۔ ایک اور ہمدرد نے کہا بھائی۔ لفظ تازہ بھی زائد ہے۔ تم باسی تھوڑا ہی بیچو گے۔ ایماندار آدمی ہو۔ اب فقط مچھلی رہ گیا۔ ایک بزرجمہر نے یہ بھی کٹوا دیا کہا دو فرلانگ سے بُو ہی بتا دیتی ہے کہ یہاں مچھلی بکتی ہے۔ عطر نہیں۔ چنانچہ وہ بھی مٹوا دیا گیا۔ خیال کہتا ہے۔ آئندہ خبروں کے کالم میں فقط سُرخیاں ہوا کریں گی۔ "ویت نام، لڑائی جاری ہے" "آٹا مہنگا، ڈیگال کامیاب، مشرقی پاکستان، طوفان، صدر جانسن پریشان، ماؤزے تنگ خوش"۔ بلکہ شاید یہ بھی نہیں۔ کیونکہ یہ باتیں سبھی کو معلوم ہیں۔ اچھا ہی ہے۔ اخباروں میں قسمت کا حال بتلانے کے لئے اور منڈیوں کے بھاؤ کے لئے اور اشتہارات کے لئے اور جگہ نکل آئے گی۔ جو آج کل خبروں میں ضائع ہو جاتی ہے۔

ہم نے افسانہ نگاری کیوں ترک کی

آلڈس ہکسلے سے کسی نے پوچھا کہ ادیب بننے کے لئے کیا کیا چیزیں ضروری ہیں۔ اس نے بے تامّل جواب دیا کہ "ایک قلم۔ ایک دوات اور کچھ کاغذ"۔ ایک رسالے میں اُردو کی مشہور افسانہ نگار جمیلہ ہاشمی کا انٹرویو شائع ہوا ہے۔ جس میں انہوں نے وضاحت کردی ہے کہ "کچھ کاغذ" سے کیا مراد ہے۔ فرماتی ہیں کہ جب میرا افسانہ لکھنے کو جی چاہا تو میں نے اپنے والد کے حساب کتاب کے رجسٹر کی جلد توڑی۔ اور اس میں لکھنا شروع کردیا؛ قیاس ہوتا ہے کہ اگر ان کے والد محترم حساب کتاب نہ رکھا کرتے۔ جیسا کہ بعض لوگ نہیں رکھتے، اور جمیلہ کے ہاتھ نہ پڑتا تو وہ افسانہ نگار نہ بن سکتیں۔ جو حضرات اپنی بہنوں، بیٹیوں کو افسانہ نگار بنانا چاہتے ہیں۔ انہیں چاہیے کہ فوراً بہی کھاتے خریدیں اور جو اپنی نورِ نظر کو اس سے محفوظ رکھنا چاہیں۔ انہیں لازم ہے کہ اپنے رجسٹروں کو دکان پر تالے کے اندر رکھا کریں۔

لیکن ہمارا تجربہ اس کے برعکس ہے۔

تم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ہم نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا افسانہ نگار کے طور پر کی تھی اور اس کے لئے نہایت عمدہ چکنے کاغذوں کی ایک کاپی مجلّد تیار کرائی تھی۔ ایک روز ہم کاپی کو افسانے کے ایک نازک موڑ پر بستر پر کھلی چھوڑ گئے۔ واپس آکر کھولا تو صورتِ احوال یوں نظر آئی۔

"امجد نے کہا۔ میری رانی بولو۔ تمہیں کیا چاہیئے۔ کہو تو آسمان کے تارے توڑ کر تمہارے قدموں میں لا بچھاؤں۔ تمہارا دامن بہار کے رنگین پھولوں اور کلیوں سے بھر دوں۔ بولو بولو کیا چاہتی ہو"۔

رانی نے کہا۔ امجد۔ مجھے دُنیا میں اور کچھ مطلوب نہیں۔ فقط

بنولے	ڈیڑھ من۔
بھوسہ	دس بوری
نمک	ایک ڈلا
گڑ	ڈھائی من
چارپائی کا بان	پانچ گٹھے
گھی	سات سیر

ہم نے جھنجھلا کے وہ صفحہ پھاڑ کے پھینک دیا۔ تھوڑی دیر میں کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے چچا عینک کو ناک کی پھننگ پر جمائے کچھ ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ بولے بیٹا یہاں ایک کاپی میں کچھ حساب لکھا تھا میں نے۔ منڈی جا رہا ہوں سودا لانے۔ کہاں گئی وہ کم بخت کاپی"۔

ہمارے نقطہ نظر سے یہ افسانہ ہمارے بہترین افسانوں میں سے تھا۔ اس کا کلائمکس یعنی نقطہ عروج اس کے آخر میں آتا تھا۔ یہ وضاحت ہم اس لئے کر رہے ہیں کہ بعض افسانوں کا کلائمکس بالکل شروع میں آجاتا ہے۔ آخری پیرا لکھتے لکھتے ہمیں ایک ضرورت سے تھوڑی دیر کو باہر جانا ہوا۔ واپس آئے تو افسانہ مکمل تھا۔

"امجد نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ میری غلام فاطمہ۔ اب میں گاؤں واپس آگیا ہوں۔ اور زندگی تمہارے قدموں میں گزاروں گا۔ رانی نے مجھ سے دغا کی۔ اب مجھے سچی محبت کی قدر ہوئی۔ صبح کا بھولا شام کو واپس آجاتے تو اسے بھولا نہ جانو۔ مجھے معاف کر دو۔

غلام فاطمہ نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ امجد۔ اب میری زندگی میں رہ گیا گیا ہے۔ چند آنسو۔ چند آہیں۔ اور ......

قمیضیں بڑی	پانچ عدد
پاجامے چھوٹے	چار عدد
تکیے کے غلاف	دس
تولیے	دو
جھاڑن	دو
کھیس چارخانہ	دو عدد
کُل ————	۲۵ عدد

ہم نے شور مچایا۔ یہ کیا غضب کر دیا!۔

بہن بولیں۔ ارے میاں کچھ نہیں۔ دھوبی کا حساب لکھا ہے۔ اس سے پہلے مرقع چغتائی کے حاشیے پر لکھا کرتی تھی، وہاں اب جگہ نہیں رہی۔ یہ کاپی خالی نظر آئی۔ اس میں لکھ دیا۔

ہم نے کہا۔ بہن اب یہ کاپی تم ہی رکھو۔ ہمارے کام کی نہیں رہی۔ چنانچہ اس روز ہم نے افسانہ نگاری کو خیرباد کہی اور شعر کہنے لگے۔ جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ شعر لکھنے کے لئے کسی کاپی یا رجسٹر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انہیں دروازے کی چوکھٹ پر لکھا جا سکتا ہے قمیض کے کفوں پر لکھا جا سکتا ہے۔ سکتا کیا معنی ہم لکھتے ہیں۔

جمیلہ ہاشمی کے انٹرویو میں ایک اور جگہ ہمیں ٹھٹکنا پڑا۔ انہوں نے فرمایا۔ "میں تو چاہتی ہوں کہ زیادہ سے زیادہ ناول لکھوں۔ لیکن یہ نوکر بہت تنگ کرتے ہیں۔" ہم نے اس کا مطلب یہ لیا کہ نوکر لکھنے سے منع کرتے ہیں کہ بی بی آپ ہانڈی روٹی دیکھیے۔ یہ کیا لکھنے لکھانے

کے پیچھے پڑ گئیں۔ اگر ایسا ہے تو ہمیں جمیلہ بیگم سے ہمدردی ہے۔ زیادہ تر نوکر آج کل ایسے ہی گستاخ اور منہ پھٹ ملتے ہیں۔ ہمارا ایک نوکر بھی ہمیں مشورہ دیا کرتا تھا کہ شاعری واعری چھوڑیئے۔ بزازی کی دوکان کھول لیجئے۔ اس میں بڑا فائدہ ہے۔ لیکن پانچوں انگلیاں ایک سی نہیں ہوتیں۔ ایک زمانے میں ہمیں خوش قسمتی سے ایک ایسا نوکر بھی مل گیا تھا۔ جو ناول نویسی میں خاصی مدد دیا کرتا تھا۔ ہم کوئی باب ادھورا چھوڑ کر کہیں باہر چلے جاتے۔ تو واپسی پر مکمل ہوتا تھا بلکہ کئی بار تو وہ موجودگی میں بھی پیشکش کر دیا کرتا تھا کہ صاحب آپ لکھتے لکھتے تھک گئے ہوں گے۔ اگر آپ میری جگہ تھوڑی دیر فرش پر پوچی ماردیں تو میں ایک آدھ باب لکھ دوں۔

آپ پوچھیں گی وہ نوکر کہاں گیا؟ اس نے ہماری نوکری چھوڑ دی۔ اور آسمان ادب پر آفتاب عالمتاب بن کر چمکا۔ آج کون ہے۔ جس نے تسنیم رومانی کا نام نہیں سنا۔ وہی تسنیم رومانی جو "لانبی زلفیں" اور "ڈوبتے دریا" نامی لافانی ناولوں کا مصنف ہے ابھی پچھلے دنوں بازار میں اس سے مڈبھیڑ ہو گئی تھی۔ ہم نے کہا جمن میاں (اس کا پیدائشی نام یہی ہے۔ پولیس کے روزنامچے میں بھی یونہی لکھا جاتا ہے) میرا نوکر بھاگ گیا ہے۔ تم چاہو تو پھر آجاؤ۔ بولا صاحب۔ آج کل تو "جلتی پرچھائیاں" نامی فلم بنا رہا ہوں۔ بہت اچھی جا رہی ہے۔ آپ چاہیں تو اگلی فلم کے گانے کے لئے آپ کو نوکر رکھ سکتا ہوں۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے آپ کا ہاتھ تنگ رہتا ہے۔ پیسے اس سے زیادہ دوں گا۔ جتنے آپ مجھے دیتے تھے۔

کسٹم کا مشاعرہ

کراچی میں کسٹم والوں کا مشاعرہ ہوا تو شاعر لوگ آؤ بھگت کے عادی زناتے پان کھاتے، مونچھوں پر تاؤ دیتے زلفِ جاناں کی بلائیں لیتے غزلوں کے تھیلے بغل میں مار کر پہنچ گئے۔ ان میں سے اکثر کلاتھ ملوں کے مشاعروں کے عادی تھے۔ جہاں آپ تھان بھر کی غزل بھی پڑھ دیں اور اس کے گز گز پر مکرر مکرر کی مہر لگا دیں تب بھی کوئی نہیں روکتا۔ پھر تانا بانا کمزور بھی ہو تو ذرا سا ترنم کا کلف لگانے سے عیب چھپ جاتا ہے۔ لیکن کسٹم والوں کے "قاعدے قانون" بڑے کڑے ہوتے ہیں۔ منتظمین نے طے کر دیا تھا کہ ہر شاعر زیادہ سے زیادہ ایک غزل وہ بھی لمبی بحر کی نہیں، درمیانہ بحر کی بلا کسٹم محصول پڑھ سکے گا جس کا حجم پانچ سات شعر سے زیادہ نہ ہو۔ پیچ یہ آن پڑا کہ مصرع ایک نہیں پانچ دیتے گئے تھے۔ وہاں دروازے پر "تلاشی" ہو گئی۔ سب کے تھیلے اور بستے باہر رکھوا لیے گئے۔ ایک صاحب نے نیفے میں ایک لمبی سی مثنوی اُڑس رکھی تھی۔ ایک اپنے موزوں میں رباعیاں چھپا کر لے جا رہے تھے۔ لیکن کسٹم کے پریونٹیو افسروں کی تیز نظروں سے کہاں بچ سکتے تھے۔ ان فرض شناسوں نے سب کو آنکا اور سب کے گریبانوں میں جھانکا۔ استاد ہمدم ڈبائیوی پر بھی انہیں شک ہوا۔ اُستاد نے ہر چند کہا کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ یہی پانچ سات شعر ہیں لیکن کسٹم والوں نے ان کے کرتے کی لانبی آستینوں میں سے ان کے "تازہ ترین دیوان

مار آستین" کا ایک نسخہ بر آمد کر ہی لیا۔ اتنی احتیاطوں کے باوجود سنا ہے بہت سے لوگ اپنا کلام ناجائز طور پر حافظے میں رکھ کر اندر گھس گئے اور موقع پاکر بلیک میں داد کھری کی۔ یعنی بلا سامعین کی فرمائش کے اسے دوبارہ سہ بارہ پڑھا۔

ہمارے کرم فرما ملک الشعرا گھڑیال فیروز آبادی نے ہمیں فون کیا تم بھی آٹھوں گانٹھ شاعر ہو۔ موقع اچھا ہے۔ ایک غزل کہہ لو۔ گھڑیال صاحب نغز گو شاعر اور گھڑیوں کے تاجر ہیں۔ فیروز آبادی اس نسبت سے کہلاتے ہیں کہ فیروز آباد تھانے کی حوالات میں کچھ روز رہ چکے ہیں۔ ہم نے عذر کیا کہ ہمارے پاس شعر کہنے کے لئے کسٹم والوں کا پرمٹ یا مشاعرے کا دعوت نامہ نہیں لہذا مجبوری ہے۔ بولے:- اس کی فکر نہ کرو میں تمہیں کسی طور اسمگل کر دوں گا۔ ہم نے کہا۔ ہم کوئی گھڑی تھوڑا ہی ہیں۔ منغض ہو کر بولے:- یہ کیا ٹک ٹک لگا رکھی ہے۔ غزل لکھو۔

ہم نے اپنے کو شاعری کی چابی سے کوکتے ہوئے پوچھا مصرع طرح کیا ہے؟

فرمایا:- ایک نہیں پانچ ہیں۔ ایک تو یہی ہے :

ع کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

ہم نے کہا: اس کا قافیہ ذرا ٹیڑھا ہے۔ ہونے تک۔ کونے تک۔ بونے تک کیا زرعی مضامین باندھنے ہیں اس میں۔؟

گھڑیال صاحب نے وضاحت کی کہ نہیں، اس کے قوافی ہیں سر۔ خر۔ شر وغیرہ۔

ہمیں اس مصرعے سے کچھ شر کی بو آئی۔ لہذا ہم نے کہا کوئی دوسرا مصرع بتایئے۔

یہ نظیر اکبر آبادی کا تھا۔

ع طور سے آتے تھے ساقی سن کے میخانے کو ہم

یہ بھی ہمیں نہ جچا۔ ہم نے کہا۔ اگر اس کے قافیے ہیں :- سن کے۔ دھن کے۔

بُن کے“ وغیرہ تو اس سے ہمیں معاف رکھئے۔

اس پر گھڑیال صاحب نے ہمیں تیسرا مصرع دیا۔

ع ہائے کیا ہو گیا زمانے کو

یہ کس کا مصرع ہے۔؟ ہم نے دریافت کیا۔

جواب ملا:۔ مہمل دہلوی کا۔

”مہمل دہلوی؟ یہ کون صاحب تھے“؟ ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔ پتہ چلا کہ سننے میں ہم سے غلطی ہوئی۔ گھڑیال صاحب نے مومن دہلوی کہا تھا۔ چوتھا اور پانچواں مصرع طرح بھی ہماری طبع رواں کو پسند نہ آئے۔ پھر ہماری صلح کل طبیعت کو یہ گوارا نہ ہوا کہ ایک مصرع لیں اور باقیوں کو چھوڑ دیں۔ بڑی ترکیب سے ایک غزل تیار کی جو بیک وقت ان پانچوں بحروں اور پانچوں زمینوں میں کھپ جائے کہ ایک مصرع ایک جگہ میں، دوسرا دوسری میں۔ ہمارا خیال تھا اس سے سبھی خوش ہوں گے۔ لیکن کوئی بھی نہ ہوا۔ جانے مس بُلبل کیسے نبھا لیتی ہیں اور اس شاعر کا کیا تجربہ ہے جس نے اقبال کے کلام میں قلم لگا کر یہ شاہکار تخلیق کیا ہے۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں تقدیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
اہا جی۔ زنجیریں۔ زنجیریں۔ زنجیریں۔
لئے آنکھوں میں سرور۔ کیسے بیٹھے ہیں حضور
جیسے جانتے نہیں۔ پہچانتے نہیں

بعض محکمے شاعری سے زیادہ مناسبت رکھتے ہیں۔ بعض کم۔ ایکسائز یعنی آبکاری کی فضا شاعری کے لئے زیادہ موزوں معلوم نہیں ہوتی ہمارے دوست میاں مولا بخش ساقی نکودری پہلے اسی محکمے میں تھے۔ ایک روز کہیں ان کا ساقی نامہ کسی رسالے

میں چھپا ہوا ان کے ڈائریکٹر صاحب نے دیکھ لیا فوراً بلایا اور جواب طلب کیا کہ آپ سارے محکمہ کے کام پر پانی پھیر رہے ہیں۔ حکومت اتنا روپیہ ناجائز شراب کی روک تھام پر خرچ کرتی ہے اور آپ کھلم کھلا لکھتے ہیں۔

خدا را ساقیا مجھے شرابِ خانہ ساز دے

یا نوکری چھوڑیئے یا شاعری چھوڑیئے۔ شاعری تو ع چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ نوکری چھوڑ کر جوتوں کی دوکان کر لی۔

کسٹم والوں کے مصرع ہائے طرح بُرے نہیں لیکن ہماری سفارش ہے کہ آیندہ کوئی محکمہ مشاعرہ کرائے تو مصرعِ طرح کے اپنے کام کی مناسبت سے رکھے۔ مثلاً کسٹم کے مشاعرے کے لئے یہ مصرع زیادہ موزوں رہے گا۔

ع داورِ حشر مرا نامۂ اعمال نہ دیکھ

ع حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

ع جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا۔ وغیرہ

اگلے ہفتے گوردھن داس کلاتھ مارکیٹ میں کپڑے والوں کی طرف سے جو مشاعرہ ہو رہا ہے اس کے لئے ہم یہ مصرعے تجویز کریں گے۔

ع ہائے اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ

ع یا اپنا گریباں چاک، یا دامنِ یزداں چاک

ع اندر کفن کے سر ہے تو باہر کفن کے پاؤں

دھوبی۔ ڈرائی کلینر۔ ٹیلر ماسٹر حضرات مشاعرہ کرائیں تو ان کے حسب مطلب بھی اساتذہ بہت کچھ کہہ گئے ہیں۔ منجملہ

ع دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

ع دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

ع تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

ع دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بندِ قبا دیکھ

موٹر ڈرائیور حضرات تو اپنے بس یا ٹرک کی باڈی پر لکھا ہوا کوئی مصرع بھی چن سکتے ہیں۔ جیسے: ع سامان سو برس کے ہیں کل کی خبر نہیں۔ ورنہ یہ بھی ہو سکتا ہے!

نے ہاتھ باگ پر ہے، نے پا ہے رکاب میں

سب سے زیادہ آسانی گورکنوں کے لئے ہے کیونکہ اردو شاعری کا ایک بہت بڑا حصہ کفن، دفن، گورکنی اور مردہ شوئی کے متعلق ہے۔ ہماری شاعری میں مُردے بولتے ہیں اور کفن پھاڑ کر بولتے ہیں۔ بعضے تو منکر نکیر تک سے کٹ حجتی کرتے ہیں۔ ع

چھیڑو نہ میٹھی نیند میں اے منکر و نکیر
سونے دو بھائی۔ میں تھکا ماندہ ہوں راہ کا

اسی طرح ہمارے شاعروں نے بہت کچھ حکیموں ڈاکٹروں اور عطائیوں کے بارے میں کہہ رکھا ہے۔ کل کلاں میڈیکل ایسوسی ایشن یا طبی کانفرنس والے یا جڑی بوٹی سفیاسی ٹوٹکا ایسوسی ایشن کے سیکرٹری سائیں اکسیر بخش کشتہ مشاعرہ کرائیں تو حسبِ ذیل تیر بہدف مصرعے کام میں لا سکتے ہیں:

ع یا الٰہی مٹ نہ جائے دردِ دل

ع آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ع پہلے تو روغنِ گل بھینس کے انڈے سے نکال

اور ع مریضِ عشق پر رحمت خدا کی۔ وغیرہ

فیملی پلاننگ کے محکمے نے پچھلے دنوں ڈھیروں نظمیں لکھوائی ہیں جن میں بعض میں ایسی تاثیر سُنی ہے کہ کسی جوڑے کو پانی میں گھول کر پلا دیں تو نہ صرف ان کو بقیہ عمر کے لئے چھٹی ہو جاتی ہے بلکہ ان کی اگلی پچھلی سات نسلیں بھی لاولد ہو جاتی ہیں ہمارے محکمۂ زراعت۔ محکمہ جنگلات۔ آبپاشی اور محکمہ مویشیاں والے بھی ان کی دیکھا دیکھی شاعری کے فروغ میں پیش از پیش سرگرم نظر آتے ہیں۔ ابھی کل ہی محکمہ زراعت اور آبپاشی نے ہمیں ذیل کے مصرعے بھیجے ہیں:

ع ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

ع کھیتوں کو دے لو پانی، اب بہ رہی ہے گنگا

ع تو برائے فصل کردن آمدی

جنگلات والوں کی پسند ملاحظہ ہو۔

ع پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے

ع کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

ع مجنوں جو مر گیا ہے تو صحرا اُداس ہے

ع ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

ایک مشاعرہ ہم ملتان کے چڑیا گھر میں پڑھ چکے ہیں۔ جس کی طرحیں حسب ذیل تھیں:۔

ع لاکھ طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا

ع کیا ہی کنڈلی مار کر بیٹھا ہے جوڑا سانپ کا

ع رگِ گُل سے بلبل کے پر باندھتے ہیں

محکمے ہو گئے۔ اب اہل حرفہ کی بھی تو ضرورتیں ہیں۔ کریانہ فروشوں کی عید ملن پارٹی ہونے والی ہے۔ اس کے لئے بھی مصرع طرح تجویز کر دیں:

ع وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

بار بر ایسوسی ایشن کے سالانہ مشاعرے کے لئے :۔

ع اب جو خط آنے لگا، شاہد کہ خط آنے لگا

ع کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

ع زخم کے بڑھتے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا؟

باکرز فیڈریشن والوں نے بھی ہم سے مصرع مانگا تھا۔ ایک نہیں دو حاضر ہیں:

ع میں دل بیچتا ہوں، میں جاں بیچتا ہوں۔ اور

ع بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم، کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

ایک مصرع جوتے والوں کی نذر ہے :۔

ع پالش میں لگا دی کرن آفتاب کی

وکیل اس مصرع سے کام چلا سکتے ہیں

ع مدعی لاکھ برا چاہے پہ کیا ہوتا ہے

اور قصاب حضرات کے لئے ہم نے :

ع کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجا نکال کے

ایک زمانے میں ہماری شاعری نے بادشاہوں اور نوابوں کی سرپرستی میں ترقی کی۔ ایک مشہور شاعر فرخی کو تو بادشاہ وقت نے خوش ہو کر مویشیوں کا ایک گلہ انعام میں دے دیا تھا۔ اس نے غالباً غزل گوئی چھوڑ چھاڑ دودھ بیچنے کا پیشہ اختیار کرلیا کیونکہ پھر اس کے خاندان میں کوئی شاعر ہم نے نہ سنا۔ ہمارے زمانے میں واٹر فنڈ والے، محکمہ زراعت والے، میلہ مویشیاں والے اس فن کے فروغ کا ذریعہ ہیں پھر کلاتھ ملوں والوں نے اس نیم جان کا پردہ ڈھکا۔ خوشی کی بات ہے کہ انکم ٹیکس اور

کسٹم والے بھی شاعری کی سرپرستی کی طرف توجہ کرنے لگے۔ ہمارے ایک دوست پولیس میں ہیں۔ انہوں نے ہمیں اطلاع دی ہے کہ وہ بھی اپنا دھوم دھامی مشاعرہ کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں ہم نے کہا۔ اس میں خرچ بہت پڑتا ہے۔ بولے یہ تم ہم پر چھوڑ دو۔ ہمارا پٹے والا جہاں طلب نامہ لے کر پہنچا۔ شاعر اپنے خرچ پر رکشہ میں بیٹھ بھاگا آئے گا۔ کھانا اسے سامنے کے تندور والے مفت کھلائیں گے۔ اور شب بسری کے لئے جگہ ہماری حوالات میں بہت ہے۔ البتہ سنا ہے مشاعرے میں ہوٹنگ وغیرہ کرتے ہیں لوگ۔

ہم نے کہا۔ ہاں کرتے تو ہیں۔

بولے۔۔ اچھا۔ پھر تو آنسو گیس کا بھی انتظام رکھنا ہوگا۔ آپ آئیں گے مشاعرے میں یا بھیجوں لال پگڑی والے کو ہتھکڑی دے کر؟

خطبہ صدارت حضرت ابن انشا

پچھلے دنوں ایک کتاب چھپی ہے۔ "چلتے ہو تو چین کو چلئے" اس کے فاضل مصنف کا کیا عمدہ قول ہے کہ انسان کی صحیح قدر اس کے وطن سے باہر ہی ہوتی ہے جہاں اس کی اصلیت جاننے والا کوئی نہیں ہوتا۔ سفر وسیلۃ الظفر کا مطلب بھی شاید یہی ہے۔ ان صاحب کا جب چین میں تعارف کرایا گیا کہ یہ اپنے ملک کے نامی گرامی ناول نویس ہیں اور فسانہ آزاد، گئودان، آگ کا دریا، خدا کی بستی اور آنگن وغیرہ انہی کی تصانیف ہیں تو یہ ہر چند کہ ناول لکھنا تو برکنار ناول پڑھنا بھی نہ جانتے تھے۔ فرطِ عجز و انکسار سے دوہرے ہو گئے۔ کسی بات کی تردید کرنا خلاف آداب جانا۔ ایک اور صاحب کسی کاروبار کے سلسلے میں کسی باہر کے ملک گئے اور ملک الشعرا ہو کر واپس آئے۔ آقائے حاجی بابا اصفہانی بھی اصفہان آنا خلاف مصلحت جانتے تھے استنبول میں تو یہ ایک رئیس کے داماد ہو کر ٹھاٹ دکھاتے تھے۔ لیکن وطن آتے تھے تو پرانے گاہک بجائے سر آنکھوں پر بٹھانے کے یہی فرمائش کرتے تھے کہ خلیفہ ذرا میرا سر تو مونڈ دیجیو اور ہاں داڑھی بھی تراش دیجیو۔ اللہ بخشے تمہارے باپ کا سا خط بنانے والا اب سارے اصفہان میں کوئی نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ استنبول کی آب و ہوا کی تعریف کیا کرتے تھے اور جب تک زندہ رہے وہیں قیام کرنا پسند کیا۔

مقصود اس قصہ کا یہ کہ ہمارا اپنے ہی شہر اور اپنے ہی پرانے کالج میں مہمان خصوصی بن کر آنا ایک طرح کی سنگین غلطی بلکہ غلط کاری ثابت ہوتا لیکن ہم نے اطمینان کر لیا ہے کہ ہمارے اس زمانے کے اساتذہ میں سے کوئی کالج میں بچا ہے تو مروت کے مارے ہماری کسی بات پر یہ نہ کہے گا کہ ہماری بلی ہمیں کو میاؤں۔

صاحبو! ویسے تو ہم آہیں بھر بھر کر اپنے ماضی کی عظمت کی جو جو داستانیں چاہیں بیان کریں لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اس درس گاہ کے برآمدوں میں دو برس جوتیاں چٹخاتے ہوتے ہم نے نہ کچھ کھویا، سوائے عزت سادات کے۔ اور نہ کچھ پایا سوائے ڈگری کے۔ ہماری کلاسیں، ایک طرح سے تعلیم بالغاں کی کلاسیں تھیں۔ ہمارے اساتذہ نے ہمارا عیب و ثواب اور نفع نقصان ہمیں پر چھوڑ رکھا تھا کیونکہ ہمارے ہم سبقوں میں ایک دو تو شائد صاحب اولاد بھی تھے۔

ان اساتذہ کے علم و فضل میں کلام نہیں لیکن ان کا فیض صحبت ہمارا کچھ بگاڑ نہ سکا۔ ہم جیسے چھلے چھلاتے اور دھلے دھلاتے آتے تھے ویسے ہی واپس گئے

ایک زمانہ تھا کہ ہم قطب بنے اپنے گھر میں بیٹھے رہتے تھے اور ہمارا ستارہ گردش میں رہا کرتا تھا۔ پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ہم خود گردش میں رہنے لگے اور ہمارے ستارے نے کراچی میں بیٹھے بیٹھے آب و تاب سے چمکنا شروع ہوا۔ پھر اخبار جنگ میں آج کا شاعر کے عنوان سے ہماری تصویر اور حالات چھپے۔ چونکہ حالات ہمارے کم تھے لہٰذا ان لوگوں کو تصویر بڑی کرا کے چھاپنی پڑی۔ اور قبول صورت سلیقہ شعار پابند صوم و صلوٰۃ اولادوں کے والدین نے ہماری نوکری تنخواہ اور چال چلن کے متعلق معلومات جمع کرنی شروع کر دیں۔ یوں عجب بیٹوں اور

نکتہ چینیوں سے بھی دُنیا خالی نہیں۔ کسی نے کہا یہ شاعر تو ہیں لیکن آج کے نہیں۔ کوئی بے درد بولا۔ یہ آج کے تو ہیں لیکن شاعر نہیں۔ ہم بددل ہو کر اپنے عزیز دوست جمیل الدین عالی کے پاس گئے۔ انہوں نے ہماری ڈھارس بندھائی اور کہا دل میلا مت کرو۔ یہ دونوں فریق غلطی پر ہیں ہم تو نہ تمہیں شاعر جانتے ہیں۔ نہ آج کا مانتے ہیں ہم نے کسمسا کر کہا۔ یہ آپ کیا فرمارہے ہیں؟ بولے میں جھوٹ نہیں کہتا اور یہ رائے میری تھوڑی ہی ہے سبھی سمجھدار لوگوں کی ہے۔

ابن انشاؔ نام ہم نے نہ جانے کب رکھا تھا اور کیوں رکھا تھا۔ کیوں رکھا تھا کی توجیہہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ ہمارے اصلی نام میں ایک چوپائے کا نام شامل ہے۔ نیا نام رکھنے کا فائدہ یہ ہوا کہ لوگ سید انشاء اللہ خاں انشا کی رعایت سے ہمیں بھی سید لکھنے لگے یعنی گھر بیٹھے ہماری ترقی ہو گئی۔ اسی نسبت سے دلی والوں نے ہمیں اپنا ہم وطن جان کر ہماری زبان پر کم اعتراض کئے اور دلّی مرکنٹائل ہاؤسنگ سوسائٹی والوں نے ایک پُر فضا پلاٹ کی ہمیں پیش کش کی۔ لکھنؤ والوں نے البتہ ہماری زبان کے نقائص کے لئے اسی کو بہانا بنا لیا کہ ہاں دلّی والے ایسی ہی زبان لکھا کرتے ہیں۔ پھر ایک روز ایسا ہوا کہ ایک صاحب نے آ کر ہمارا ہاتھ ادب سے چوما اور کہا۔ واللہ۔ آپ تو چھپے رستم نکلے۔ آپ کا کلام پڑھا اور جی خوش ہوا۔ ہم نے انکسار برتا کہ ہاں کچھ ٹوٹا پھوٹا کہہ لیتے ہیں۔ آپ نے کون سی غزل دیکھی ہماری۔ حافظے پر زور ڈال کر بولے کچھ اس قسم کی ہے۔ کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں۔ ہم نے کہا۔ کہاں پڑھی ہے۔ بولے۔ مولوی محمد حسین آزاد کی آبِ حیات میں منقول ہے۔

جنگ میں آج کا شاعر کے ضمن میں خواتین کے بھیجے ہوئے پسندیدہ اشعار بھی

چھپا کرتے ہیں۔ ایڈیٹر صاحبہ نے ہمیں فون کیا کہ ذرا چیک کر کے بتایئے یہ سارے اشعار آپ کے ہیں۔؟ بعض اوقات بی بیاں مختلف شاعروں کے اشعار کو خلط ملط بھی کر دیتی ہیں۔ ہم نے کہا سنایئے۔ ان میں بھی پہلا شعر جو کوئی دس خواتین کی پسند تھا یہی تھا۔ ع کمر باندھے ہوئے ..... یہ غزل ہمیں ہمیشہ سے پسند رہی ہے لہٰذا ہم نے ایڈیٹر صاحبہ سے کہا کہ کسی کا دل توڑنے کی ضرورت نہیں اگر کسی کو ہمارا یہی شعر پسند ہے تو خیر چھاپ دیجئے۔ دوسرا شعر بھی اسی غزل کا تھا۔

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

ہم نے کھنکار کر کہا خیر یہ بھی ٹھیک ہے آگے چلئے۔ اس سے اگلا شعر تھا۔

یاد آتا ہے وہ حرفوں کا اٹھانا اب تک
جیم کے پیٹ میں اک نقطہ ہے سو خالی ہے

ہم نے کہا۔ ہمیں یاد نہیں پڑتا کہ یہ شعر ہمارا ہو۔ مشتبہ بات ہے۔ اسے کاٹ دیجئے اس کے بعد نوبت ان شعروں پر پہنچی۔

کہیں بچھڑا ہوا دیکھا جو اک سُرخاب کا جوڑا
تو ڈھاریں مار کر رو دیا بطِ گرداب کا جوڑا

لگی غلیل سے ابرو کی، دل کے داغ کو چوٹ
پڑا ایسی ہے کہ لگے تڑسے جیسے زاغ کو چوٹ

شوق سے تو ہاتھ کو میرے مروڑ
ہیں ذرا پنجہ مروڑوں کس طرح

اس پر ہم گھبرائے اور کہا جانثار کلا یہ ہمارے شعر نہیں۔ اس مرحوم کے ہیں کہ میر ماشاء اللہ خاں کا بیٹا تھا اور دلی کا تھا۔ پہلی بار افسوس ہوا کہ ہم نے یہ نام کیوں رکھا۔ اس سے تو وہ چوپائے والا نام ہی اچھا تھا۔ شیر محمد خاں۔ چھوٹوں موٹوں کی تو ایسا نام سن کر ہی گھگی بندھ جاتی ہے۔

پروفیسر ایوب قادری نے کہ محقق آدمی ہیں اس تقریب سے ہم پر مضمون لکھنے کا بیڑا اٹھایا تو ایک دوست نے مخبری کی کہ انہوں نے انجمن ترقی اردو کے کتب خانے میں تمام پرانے تذکرے اور مخطوطے کھنگال ڈالے۔ کہیں آپ کے حالات نہیں ملے۔ لہٰذا اب وہ آپ سے ملیں گے اپنے پر مضمون لکھا جانے کا سن کر کون خوش نہیں ہوتا۔ ہم نے کہا چشم ما روشن دل ما شاد۔ قادری صاحب کے لئے کسی ایسے شخص پر مضمون لکھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا جو ابھی مرا نہیں اور قریب المرگ بھی دکھائی نہیں دیتا لیکن ریسرچ کا آدمی کبھی مار نہیں کھاتا۔ آئے تو سوالات سے مسلح ہو کر آئے۔ سب سے پہلے ہمارا اسم گرامی دریافت کیا وہ ہم نے خوشی سے بتا دیا۔ ولدیت بھی۔ عمر ہم اپنی موقع محل کے مطابق دو چار سال گھٹا کر یا بڑھا کر بتایا کرتے ہیں۔ یہاں بڑھا کر بتائی کہ اپنے مہمان خصوصی کو بالکل ہی بچہ نہ سمجھ لیں۔ کہاں پیدا ہوتے تھے اور کیوں پیدا ہوتے تھے کا ہم کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے۔

شجرہ نسب مانگ رہے تھے۔ ہمارے پاس کہاں سے آتا۔ ہم نے کہا بزرگوں میں اپنے والد کا نام یاد ہے یا ایک اور مورث اعلیٰ کا کہ اپنے زمانے کے مشہور پیغمبر تھے۔ بولے کون۔ ہم نے حضرت آدم علیہ السلام کا نام بتایا تو عقیدت سے ادھ موئے سے ہو گئے۔ تعلیم کا پوچھا۔ کچھ ہوتی تو بتاتے۔ فرمایا تعلیم نہیں تو ڈگریاں تو ہوں گی۔ وہ ہم نے بتا دیں۔ کہنے لگے آپ سنا ہے یونیورسٹی میں اول آئے تھے؟ انکار کا کچھ

فائدہ نہ تھا ہم نے اقبال کیا۔ بولے۔ اس سال ایک سے زیادہ طالب علم تھے کیا؟ اس سوال کو ہم ٹال گئے۔ پوچھا شاعری میں کس کے شاگرد ہیں۔ ہم نے ماسٹر چنتن سنگھ دلگیر۔ اور چھجو رام تشنہ اور منشی اللہ دین چراغ ریواڑوی کے نام لکھوا دیتے۔ قوم۔ گوت۔ نوکری۔ تصانیف اور نہ جانے کیا کیا لکھ چکے تو بولے۔ ہمارے تحقیق کے اصولوں کے مطابق خاصی معلومات جمع ہو گئیں۔ یہ معاملہ کچا رہا کہ آپ کے بزرگ خراسان سے نہیں آئے تھے۔ اور صاحب دیوان وغیرہ نہیں تھے لیکن خیر۔ اب ایک آخری سوال باقی ہے۔ آپ کی تاریخ وفات کیا ہے؟ یہ ہم نے بتانے سے انکار کر دیا۔ اس پر وہ کچھ ملول اور افسردہ واپس گئے۔ خود ہمیں بھی افسوس ہوا کہ اس سلسلے میں ان کی تشفی نہ کر سکے حالانکہ وہ ہمارے ہی بھلے کی کہہ رہے تھے۔

خیر صاحبان اب تو ہماری صدارت کا سفینہ کنارے پر آلگا۔ تم وجود نا خدا کہنے کا کیا فائدہ۔ آپ صاحبوں نے مجھے مہمان خصوصی بنایا۔ بہت شکریہ۔ اس میں اتنی تاخیر کی تو اس کا کچھ ملال نہیں۔ ہمارے ملک میں جوہر قابل کی قدر شناسی میں عموماً دیر ہو ہی جاتی ہے۔ واللہ ہمارا دل آپ کی طرف سے صاف ہے۔ یار زندہ صحبت باقی۔ یہ کالج ہماری مادر علمی ہے اور اس سے ہمیں دلی محبت ہے۔ آئندہ بھی آپ حضرات کسی جلسے کی صدارت یا تقسیم اسناد کے لئے یاد فرمائیں گے۔ تو اپنی بے پناہ مصروفیات کو پس پشت ڈالنے میں عذر نہ ہو گا۔ کیونکہ وہ انسان کیا جو کسی کے کام نہ آئے۔ دامے درمے کی بات تو چھوڑیئے کہ دنیا میں روپیہ ہی سب کچھ نہیں ہے۔ ہاں قدمے سخنے اس کالج کی خدمت میں دریغ نہ ہو گا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آج کے جلسے میں زیادہ آدمی نہیں ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اخبار میں جلسے کا اعلان ہو گیا تھا جس میں ہمارا نام بھی درج تھا۔ بہر حال زیادہ مجمع سے اس فقیر گوشہ گیر کا جی ہمیشہ گھبراتا ہے۔ تاہم میں ان اہل

ذوق حضرات کا تہ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جو منتظمین یا مضمون پڑھنے والوں یا لذات لینے والوں یا پانی پلانے والوں کے علاوہ یہاں موجود ہیں۔ اگر کوئی ہیں تو! جمیل الدین عالی صاحب کا شکریہ بطور خاص مجھ پر فرض ہے۔ جنہوں نے میرے ایما پر کالج والوں سے کہا کہ مجھ سے مہمان خصوصی بننے کی درخواست کریں۔ اور اس کے ملتے کالج کا پرانا طالب علم ہونے کا عذر یا عذر لنگ ڈھونڈا۔ پھر وہ جلسے میں حاضرین کی کمی کو پورا کرنے کے لئے اپنے اہل و عیال کو اپنی کار میں بھر کر لاتے۔ یہ ان کا دوسرا احسان ہے۔ سچے دوستوں کی پہچان ایسے ہی موقع پر ہوتی ہے اور اب سیکرٹری صاحب سے گزارش ہے کہ انہوں نے دریوں، کرسیوں، شامیانے، کوکا کولا اور آج کے جلسے کے خرچ کی دوسری تفصیل تیار کر لی ہو تو مجھ سے الگ آ کر ملیں۔ یہ ایک خصوصی معاملہ ہے اور اپنے پیارے کالج کی بات ہے ورنہ تو ایسے جلسوں کا خرچ عموماً میزبان خود ہی اٹھایا کرتے ہیں۔

یہ پاگل پاگل پاگل فلمی دُنیا

ہم نے پچھلے دنوں انگریزی کی ایک فلم دیکھی۔ نام ہے اس کا THE MAD MAD MAD MAD WORLD یعنی پاگل پاگل پاگل دنیا۔ فلم دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہ جو چار بار پاگل لکھا ہے۔ دس بیس بار لکھنا چاہیئے تھا غالباً جگہ کی گنجائش مانع رہی ہوگی۔ آغاز یوں ہوتا ہے کہ ایک شاہراہ پر کچھ موٹریں ٹرک آگے پیچھے جا رہے ہیں ایک کار لڑھک کر گہرے کھڈ میں گر جاتی ہے۔ لوگ نیچے پہنچتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ گاڑی کا سوار قریب المرگ ہے۔ اس نے بتایا کہ یارو میں تو دُنیا سے سفر کر رہا ہوں لیکن فلاں سطح مرتفع پر ایک خزانہ دبا ہے۔ لاکھوں کے نوٹ ہیں نشانی اس کی دو کھجوریں ہیں' اما بعد

اک طرف منہ پھیر کر رونے لگے تیمار دار
اک طرف بیمارِ غم کچھ کہہ کے رخصت ہوگیا

بے شک بیمارِ غم کچھ کہہ کے رخصت ہوگیا لیکن تیمار داروں کے رونے کی بات صحیح نہیں۔ سب نے فی الفور دوڑ لگا دی۔ سب کو پہلے پہنچنے کی فکر تھی۔ باقی فلم دولت کے لئے اسی دوڑ کی ہے۔ آخر میں۔۔۔۔ لیکن باقی آپ پردۂ سیمیں پر دیکھئے یہ فلم پُرلطف تھی بہت پُرلطف چلتی رہی۔ اس میں سب کچھ تھا جو انشراحِ قلب کے لئے ضروری ہے لیکن

اس میں سب کچھ تھا جو انشراحِ قلب کے لئے ضروری ہے لیکن

اپنے وطن کی مٹی کی خوشبو نہ تھی لہٰذا ہمارے دوست ہمیں با بدست دگرے ایک مقامی، سراسر مقامی فلم میں لے گئے کہ فلم دیکھنی ہے تو یہ دیکھو۔ دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا ہے۔ کس چیز کی کمی ہے خواجہ تری گلی میں۔ عشق و محبت اس میں۔ پند و نصیحت اس میں۔ مار کٹائی سے معمور مزاح کے لڈوؤں سے بھرپور۔ ظالم سماج کا "تانا بانا" بھی ہے اور زندہ ناچ گانا بھی ہے۔ جا بجا بے لوث محبت کے پھول کھلتے ہیں اور آخر عاشق معشوق گلے ملتے ہیں۔

فلم کا نام ہم نہیں لکھتے۔ لکھنے کی ضرورت بھی نہیں بلکہ نہ لکھنے میں ایک حکمت ہے اس شخص کا ذکر آپ نے سنا ہو گا جو غصے میں بھرا کف اڑاتا سینما کے مینجر کے پاس پہنچا اور کہا میری بیوی اس وقت ایک غیر مرد کے ساتھ بیٹھی سینما دیکھ رہی ہے۔ میں اسے گولی مار دوں گا۔ مینجر نے اسے تو بٹھایا اندر ہال میں سکرین پر اعلان کرا دیا کہ باہر کسی بی بی کا میاں پستول لیے بیٹھا ہے۔ ہم دو منٹ کے لئے لائٹ بند کرتے ہیں۔ وہ بی بی اور اس کا ساتھی چپ چاپ اندھیرے میں نکل جائیں۔ دو منٹ کے بعد لائٹ کھولی گئی تو ہال قریب قریب خالی تھا۔ پس جو فلم والا چاہے اسے اپنے سے متعلق کرے۔ ہمارے دوستوں نے تو سوالات کر کے کسوٹی کے قاعدے سے بھی اس فلم کا نام پوچھنے کی کوشش کی۔

"یہ فلم پنجابی کی ہے؟" ہمارے عبید اللہ بیگ نے پوچھا۔

"جی"۔ ہم نے جواب دیا۔

"مار کٹائی کے سین سے شروع ہوتی ہے؟" ہمارے افتخار عارف نے سوال کیا۔

"جی"

"اس میں وجہ بے وجہ مری اور سوات کے مناظر ہیں"

"جی"

"ولن بڑھکیں مارتا ہے؟"

"جی"

"مسخرہ اُلٹی چھلانگیں لگاتا ہے؟"

"جی"

"طوائف کا کوٹھا اس میں ہے؟"

"جی"

"جیل کی سلاخیں بھی؟"

"جی۔ جی"

"سب ایک دوسرے کے لئے ایثار کرتے ہیں؟ بلکہ ایثار کرنے کے لئے ایک دوسرے پر گرے پڑتے ہیں؟"

"جی"

"ہن کی آنکھیں پٹ پٹ کھلتی ہیں؟"

"جی ہاں۔ جی ہاں"

"اسے بنے ہوئے پچاس سال سے زیادہ ہو گئے"

"آپ پروڈکشن کے معیار کو دیکھتے ہوئے کہہ سکتے ہیں"

"اس میں "لال موری پت" گایا گیا ہے؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟"

"اس میں فردوس ہے۔ اعجاز ہے۔ غالباً نغمہ بھی"

جی ہاں۔ لیکن آپ کے سوالوں کا کوٹا ختم ہو گیا۔ اب فلم کا نام بتایئے"

روکھے ہو کر بولے "جناب آپ ہی بتا دیجئے۔ ہم ہار گئے"

ہم نے کہا۔ "آپ نے تو ساری نشانیاں بتا دیں"

تب انہوں نے بتایا کہ ہیرو کی مار کٹائی۔ طالب و مطلوب کا بچھڑنا ملنا، مری اور سوات کے سین بے گناہ قیدی، طوائف کا کوٹھا، اُلٹی چھلانگ لگانے والا مسخرہ اور بڑھکیں مارنے والا ولن سب فلموں میں مشترک ہوتے ہیں۔ لال موری پینٹ کا بھی ہر فلم میں ہونا ضروری ہے۔ حتیٰ کہ کاسٹ بھی قریب قریب ساری پنجابی فلموں کی ایک ہی ہوتی ہے لہٰذا بتائیں تو کیا بتائیں۔

یہ بیان ان صاحب کا تھا۔ ہم پر اس کی ذمہ داری نہیں کیونکہ ہم تو عید بقر عید پر فلمیں دیکھنے والے ہیں۔ ہم تو اپنے مختصر تجربے کی روشنی میں اتنا کہہ سکتے ہیں کہ یہ فلمیں خصوصاً پنجابی فلمیں، تنہا دیکھنے کی نہیں۔ جانے ہوتے غالب کی طرح اپنے ساتھ نوحہ گر لے کے جانا چاہیے جو رلانے والا سین ہو تو آپ کی آنکھیں تولیے سے پونچھے۔ کولہے مٹکانے کا سین ہو تو آپ کی آنکھیں ہاتھ رکھ کر بند کر دے۔ ہنسانے والا سین ہو تو آپ کی بغل میں گدگدی کرے۔ آپ نڈھال ہونے لگیں تو آپ کو اسپرو کھلاتے۔ لخلخہ سنگھاتے۔ آپ کے منہ پہ پانی کے چھینٹے مارے۔ پھر ساری فلم کے دوران میں آپ کے کانوں میں انگلیاں دیتے رکھے۔ ہم اپنے ساتھ کسی فالتو آدمی کو نہ لے گئے تھے لہٰذا اپنی ہی انگلیاں کانوں میں دیتے رہے۔ پنجابی فلموں کا ہر کردار آغا حشر کا تربیت یافتہ معلوم ہوتا ہے۔ اتنا اونچا بولتا ہے کہ سینماؤں کو ایمپلی فائر لگانے کی حاجت نہیں۔ ہاں کوئی آلہ آواز دھیمی کرنے والا ہو تو اس کا لگانا مستحسن ہو گا۔

اس فلم میں چھ گانے، آٹھ مزاحیہ سین، دس دردناک مناظر، تین قاتلانہ حملے، بارہ لپاڈگیاں اور پندرہ سسپنس تھے۔ یہ مسالہ جس سے دوسرے ملکوں میں پچاس فلمیں بناتی ہیں۔ ہمارے ہاں ایک ہی فلم میں ڈال دیا جاتا ہے۔ پھر بھی لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے

فلمساز محنت نہیں کرتے۔ پچھلے دنوں ٹیلیویژن پر فلمسازوں اور فلم بینوں کا ایک مباحثہ ہوا تھا۔ وہاں ایک فلم بین نے اس بات کی تعریف کرنے کی بجائے اس پر اعتراض کیا ٹیلیویژن والوں نے دونوں پارٹیوں کے درمیان احتیاطاً میز وں کا ایک جنگلا بنا دیا تھا ورنہ ایک فلم ڈائرکٹر تو اس فلم بین کو ضرور مار بیٹھتے۔ ہائے ہائے ہمارے ملک کے پاگل پاگل پاگل فلمساز۔ اگر وہ برا مانیں تو یوں سہی۔ یہ پاگل پاگل پاگل پاگل فلمیں دیکھنے والے کہ ایک ہی فلم کو مختلف ناموں سے بار بار ہم دیکھے جا رہے ہیں۔

فلم دیکھئے اور ثواب دارین حاصل کیجئے

لاہور کے حکام پر ایک سہانی صبح یک لخت یہ انکشاف ہوا کہ سینما والے عریانی پھیلا رہے ہیں۔ توبہ توبہ اس اسلامی مملکت میں ایسا کام؟ ایسا اندھیر؟ فوراً پیادے دوڑائے گئے منادی کرا دی گئی کہ اب تک جو ہوا سو ہوا۔ آئندہ کے لئے بے حیائی بند ہونی چاہئے ورنہ ہم سے برا کوئی نہ ہوگا۔ پولیس والوں کی ڈیوٹی لگائی گئی کہ جہاں کوئی عریاں، خلاف تہذیب یا منافی اخلاق بورڈ سڑک پر نظر آئے اسے اتار لو۔ باقی کارروائی اس کے بعد کی جائے گی۔ پولیس والے چور پکڑتے پکڑتے بلکہ نہ پکڑے پکڑتے تنگ آ گئے تھے، اکتاہٹ میں جمائیاں لے رہے تھے۔ ان کو ایسا کام خدا دے۔ دیکھتے دیکھتے خلاف شرع بورڈوں کا ڈھیر لگ گیا۔ میکلوڈ روڈ اور ایبٹ روڈ وغیرہ صاف ہو گئیں، معاشرہ آلودگیوں سے پاک ہو گیا۔ ہر طرف تہذیب و اخلاق کی ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں۔ نیکی کا نور پھیل گیا۔

اب ان بورڈوں کا جائزہ شروع ہوا۔ ملزم یعنی فلموں والے بھی موجود تھے۔ درِ عدالتِ ناز کھلا۔ گواہِ عشق طلب ہوئے۔ صدر عدالت نے انصاف کی ترازو ہاتھ میں تھامی

اور پوچھا۔

"تھانیدار جی۔ یہ بورڈ آپ نے کیوں اتارا۔ وجہ بیان کیجئے"۔

"حضور اس میں عورت کی ٹانگیں ننگی دکھائی گئی ہیں"۔

"چ چ چ چ چ۔ بری بات۔ ہاں میاں فلم دین۔ تم نے ایسا مخرب اخلاق بورڈ کیوں لگایا"۔

"حضور، عالی جاہ۔ یہ انگریزی فلم ہے۔ اس میں جیسی ٹانگیں ہوتی ہیں۔ ویسی ہم نے بورڈ پر بنا دیں"۔

"ہاں بات تو آپ کی ٹھیک ہے۔ تھانیدار جی یہ تو انگریزی فلم ہے۔ اس میں ٹانگیں کیسے بدلی جا سکتی ہیں۔

"عالی جاہ جب یہ لوگ انگریزی فلم کا نام بدل لیتے ہیں FOREVERAMBER کو "منڈیا سیالکوٹیا" کا نام دے کر دکھاتے ہیں تو ٹانگیں کیوں نہیں بدل سکتے خیر ٹانگیں بدلنے کی ضرورت نہیں۔ پاجامہ پہنایا جا سکتا ہے۔ شلوار پہنائی جا سکتی ہے۔ ننگی ٹانگوں سے جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں"۔

"آپ کے جذبات مشتعل ہوئے"۔

جی میرے جذبات۔۔۔؟ میرے؟ حضور میں عوام کے جذبات کی بات کر رہا ہوں"۔

"میاں فلم دین۔ تھانیدار صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔ ان ٹانگوں پر شلوار ہونی چاہیے انگریزی غیر انگریزی کی بحث میں ہم نہیں پڑتے"۔

"حضور تھانیدار جی ٹھیک کہتے ہیں اور آپ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔ بورڈ پر تو میں شلوار پہنا دوں گا۔ لیکن فلم کے اندر صوفیہ لورین کو کیسے پہنا دوں؟ اس نے نہ پہنی تو۔

"صوفیہ لورین؟ اس کا مطلب ہے۔ آپکی فلم میں چوما چاٹی بھی ہوتی ہوگی۔ آپ
کو شرم نہیں آتی، چوما چاٹی کی فلمیں دکھاتے۔؟

"حضور پاکستانی فلمیں دکھاتے وقت شرم آتی ہے۔ اسی لئے فی الحال پاکستان
فلموں میں چوما چاٹی نہیں دکھاتے۔ انگریزی امریکی فلموں میں البتہ۔ حضور۔ آپ اتنے پاجامے
کہاں سے لائیں گے۔ ان فلموں کی درآمد کیوں نہیں روک دیتے"۔

"چپ تم کو پالیسی کے معاملوں میں دخل دینے کو کس نے کہا۔ ہاں تو تھانیدار صاحب
دوسرا بورڈ دکھایئے۔ ہاں اس میں کیا ہے"۔

حضور خود ہی دیکھ لیجئے۔

جوش ملیح آبادی کی زبان میں جیسے گدرا ناز"۔

"بہت شرمناک بات ہے۔ دور کرو اسے میری آنکھوں سے۔ ذرا ٹھہرو۔ دیکھ لوں۔
تصدیق کر لوں۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ کیوں میاں فلم دین"۔

"جناب میں کیا عرض کروں۔ آپ عورتوں سے فلموں میں کام کروائیں گے تو عورتیں
تو ایسی ہوتی ہی ہیں۔ مردانہ اور زنانہ جسم میں فرق ہوتا ہے"۔

"میاں فلم دین تم یہ ہمیں بتا رہے ہو؟ ارے ہم سے زیادہ کسے معلوم ہوگا۔ لیکن فلموں
میں بس سپاٹ سپاٹ جسم دکھایا کرو۔ تاکہ بے حیائی نہ پھیلے۔ اچھا اب آپ جایئے
آپ تو ایبٹ روڈ کے ہیں نا" اب میکلوڈ روڈ کے تھانیدار کو بلایئے"۔

حضور سلام"۔

"سلام۔ آپ تو حاجی معلوم ہوتے ہیں"۔

"جی میں حاجی ہی ہوں"۔

"پھر تھانیدار کیسے بنے ہیں"۔

"جناب اگر تھانیدار نہ ہوتا تو جج کیسے کرتا۔ اتنے وسائل کہاں سے لاتا"۔

"آپ کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ دکھایئے آپ نے کونسا بورڈ اتروایا ہے۔ ہاں تو بورڈ میں کیا ہے"۔

"جناب یہ 'رنگیلی دنیا' کا بورڈ ہے۔ اس میں ہیروئن کے پاؤں ننگے دکھلائے گئے ہیں"

"اس پر کیا اعتراض ہے"۔

"جناب والا بعض لوگوں کے دل تو ننگے پاؤں دیکھ کر بھی پامال ہو جاتے ہیں۔ یہ طبی نقطہ نگاہ سے بھی مضر ہے۔ ننگے پاؤں پھرنے سے زکام ہو جاتا ہے"۔

"حاجی صاحب۔ آپ اس وقت صرف اخلاقی نقطہ نظر سے بات کریں۔ یہ دوسرا بورڈ آپ نے کیوں اتروایا۔ اس میں تو پاؤں بھی ننگے نہیں ہیں۔ ہیروئن نے دستانے تک پہن رکھے ہیں۔ فقط چہرہ کھلا ہے۔

"حضور ساری خرابی تو چہرے ہی کی ہے۔ جس نے ڈالی بری نظر ڈالی۔ عورتوں کو منہ ڈھانپ کر فلم میں آنا چاہیئے۔

"بے شک۔ یہ اشتہار کس فلم کا ہے؟"۔

"یہ تبت سنو کا ہے جی"۔

"یہ کس کی فلم ہے کس سینما میں چل رہی ہے؟"

"جناب یہ تو مجھے معلوم نہیں، میں فلمیں نہیں دیکھتا۔ سڑک پر بورڈ نظر آیا اکھاڑ لیا"۔

"بہت اچھا کیا آپ نے۔ آپ کو تمغہ شجاعت دینا چاہیئے۔ عدالت برخاست"۔

بات بورڈوں سے شروع ہوتی ہے۔ ابھی فلموں تک نہیں پہنچی۔ بس پہنچنے ہی والی

ہے۔ سنا ہے ریاض شاہد کی فلم غرناطہ کے بارے میں سنسر بورڈ کو تامل ہے کہ اس میں رقص کیوں ہیں، کہانی مجاہدانہ ہے بلکہ بہت ہی مجاہدانہ جس کے لئے جناب نسیم حجازی کا نام ضمانت بلکہ ناقابلِ واپسی ضمانت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ غرناطہ میں اسلامی سلطنت تھی تو لوگ سارا وقت سر پر خود رکھے۔ شمشیر کو بے نیام کئے حق اللہ کے نعرے لگاتے پھرتے ہوں گے۔ کوئی دکانداری کا ہے کو کرتا ہو گا اور تفریح کا کیا سوال ہے رقص تو بہت معیوب چیز ہے۔ یہ جو کسان لوگ فصل کٹنے کے بعد بھنگڑہ ناچتے ہیں۔ بعض متین حضرات کو ہم نے اس پر بھی اعتراض کرتے دیکھا ہے اور عورتوں کے رقص کی تو پھر بات ہی اور ہے۔ ہم کئی بار عرض کر چکے ہیں کہ چھوٹی چھوٹی اصلاحیں کرنے کا کچھ فائدہ نہیں۔ اصلاح پوری ہونی چاہئے۔ اسلامی مملکت میں فلم بنے تو اس میں شراب اور شرابیوں کے سین کا کام کیا۔ لوگ لسی پئیں کہ ہمارا قومی مشروب ہے اور اس کے بعد مونچھیں صاف کرتے اور ڈکار لیتے ہوئے الحمد للہ بھی کہیں تو اور مناسب ہے وہیں آوارہ ہوں آوارہ ہوں، قسم کے گانے اور غنڈہ گردی کے سین، ہیروئن پر حملے خواہ وہ غیر مجرمانہ ہی کیوں نہ ہوں۔ آخر کہاں ہماری تہذیب کا حصہ ہیں۔ چھی۔ چھی۔ بری بات اور ہم تو کئی بار یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ عشق و عاشقی کو فلموں میں سے نکال دیجئے۔ ساری قابلِ اعتراض باتیں نکل جائیں گی۔ ہیرو ہیروئن کو بھگے داموں بعض اس لئے فلم میں ڈالنا پڑتا ہے کہ عشق کریں اور ولین بھی تاکہ اس عشق میں کھنڈت ڈالیں۔ اب جبکہ ہماری فلمی صنعت کے اکثر لوگ حاجی ہو چکے ہیں۔ ہماری اس گذارش پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔ جو لوگ مصر ہیں کہ رومانی مناظر کے بغیر فلم نہیں بن سکتی ان کی تالیف قلب کے لئے ہمیں ایک دوست کا یہ مشورہ پسند آیا کہ سارے رومانی سین تو رکھے جائیں، فقط اس وقت کیمرہ بند رکھا جائے۔

روپیہ کمانا

شیخ سعدی نے فرمایا ہے کہ خطاست بزرگان گرفتن خطا است۔ لیکن کیا کیا جائے ہماری تو ساری زندگی بزرگوں کی خطائیں پکڑتے اور ان کے مقولوں کو غلط ثابت کرتے گزر گئی۔ بزرگوں کو بھی کچھ ہم سے ضد معلوم ہوتی ہے کہ جو بات فرمائیں گے غلط فرمائیں گے انہی میں ایک مقولہ یہ سننے میں آتا ہے کہ دولت آنی جانی ہے۔ یعنی آتی ہے اور جاتی ہے۔ ہمیں اس کا یہ دوسرا روپ (جانے کا) تو دیکھنے کا اکثر اتفاق ہوا بلکہ ہر روز ہوتا ہے۔ لیکن آتی کس راستے ہے۔ یہ کبھی تحقیق نہ ہوا۔ کتنی بار تو ہم اس راہ پر بھی امید وار بیٹھے جو تری راہ گزر بھی نہیں لیکن بے سود۔ پھر یہ بھی سُنا کہ روپیہ تو ہاتھوں کی میل ہے۔ بے شک یہ درست ہوگا لیکن یہ نکتہ سمجھ میں نہ آیا کہ صرف دوسروں کے ہاتھوں کی میل کیوں ہے۔ آخر ہمارے بھی تو ہاتھ ہیں۔ ان پر بھی تو یہ میل جمنی چاہیئے۔ شیخ سعدی مرحوم نے تونگری کے موضوع پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ حالانکہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے۔ انہیں خود اس سے کم ہی واسطہ پڑا۔ ایک شعر وہ ہمارے بارے میں بھی کہہ گئے ہیں ؎

قرار بر کفِ آزادگاں نہ گیرد مال
نہ صبر در دلِ عاشق نہ آب در غربال

آپ تو خیر فارسی جانتے ہیں۔ نہ جاننے والوں کے لئے اس کا ترجمہ یہ ہے کہ جس طرح عاشق کے دل میں صبر اور چھلنی میں پانی نہیں ٹھہر سکتا۔ اسی طرح آزاد منش لوگوں

کی ہتھیلی پر پیسہ نہیں ٹکتا۔ ان میں سے دو باتیں تو ہماری آزمودہ ہیں۔ صبر در دل عاشق والی اور مال والی۔ پانی والی بات کا تعلق چھلنی سے ہے۔ سو پانی جانے اور چھلنی جانے۔

روپے کے متعلق ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ملے تو براہ راست ملے۔ چھپّر پھاڑ کے ملے۔ رستے میں پڑا ہوا ہاتھ آجائے یا الہ دین اپنا چراغ کچھ دن کو مستعار دے دے۔ کاروبار اور نوکری سے پیسہ ملا تو کیا ملا۔ ایسے تو ہر کوئی کما سکتا ہے۔ کام کرنے کی پخ ہمیں پسند نہیں اس سے تو روپیہ ملنے کی خوشی آدھی رہ جاتی ہے۔

آخر ایک روز مراد دلی بر آئی۔ ایک بزرگ خضر صورت ملے اور بولے۔ بچہ غم نہ کر۔ کچھ ہم فقیروں کی خدمت کر اور ہم سے ۲۴ کیرٹ گولڈ۔ یعنی تا مدنیا نوالہ کا خالص سونا بنانے کا نسخہ حاصل کر۔ چونکہ انسان کچھ کھو کر ہی پاتا ہے۔ یہ بھی داناؤں کا مقولہ ہے۔ جس کو ثابت کرنے کے لئے جو کچھ ہمارے پاس تھا۔ ہم نے ان بزرگ کی خدمت میں کھویا لیکن آخر وہ نسخہ کیمیا ہاتھ آہی گیا۔ ان بزرگ نے بتایا کہ۔ یہ نسخہ قارون بادشاہ سے ان تک دست بدست پہنچا ہے۔ ہر کسی کو وہ نہیں بتاتے۔ اور ہم نے جو دامے درمے ان کی خدمت کی ہے اسے محصول ڈاک اور خرچہ اشتہارات کی مد میں شمار کیا جائے۔ یوں پیسہ لینا ان کے لئے حرام ہے۔

اس نسخے کے بعض اجزا تو بڑی آسانی سے دستیاب ہو گئے لیکن بعض کی بہم رسانی میں کچھ وقت پیش آئی۔ شیر کے ناخن بھی مل گئے۔ اور بجو کی کھال بھی ایک بزرگ نے عنایت کر دی۔ لگڑ بگڑ کی ریڑھ کی ہڈی کا برادہ بھی بڑی دوڑ دھوپ کے بعد آخر میسر آگیا اب فقط کانے اُلو کی تھوڑی سی بیٹ جمع کرنی تھی۔ جس کی شرط یہ تھی کہ چاند رات کی چودھویں کو بوقت نیم شب جب وہ نیم کے درخت پر استراحت کر رہا ہو تو اس کے گھونسلے سے حاصل کی جائے۔ پہلی دقت تو اُلوؤں کا مہاراجہ رنجیت سنگھ تلاش

کو نسے ہیں ہوئی۔ اُلوؤں۔ خصوصاً ان اُلوؤں سے جن کا شمار پرندوں یا جانوروں میں ہوتا ہے ہمارا واسطہ کم ہی پڑتا ہے۔ ایک اُلو ملا تو یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ دونوں آنکھیں درست ہیں۔ ایک اس نے یادالہی میں بند کر رکھی تھی اور دوسری شکار کے لئے کھلی رکھی تھی۔ کئی دن کی دوڑ بھاگ کے بعد ایک آٹھوں گانٹھ کمیت اُلو ملا تو وہ نیم کے درخت پر نہیں تھا۔ ایک کیکر کی پھننگ پر تھا۔ نیم کا درخت پاس ہی تھا۔ وہ چاہتا تو اس پر بیٹھ سکتا تھا، کوئی امر مانع نہ تھا لیکن ہمیں تنگ جو کرنا ہوا۔ ایک بار نیم کی شاخ پر بیٹھا مل گیا تو قریب جانے پر معلوم ہوا کہ کوئی اور جانور ہے۔ اور جب نیم اور کالے اُلو کا قران السعدین ہوا بھی تو تاریخ چاند کی تیرھویں نکل آئی۔ خیر ہم نے شک کا فائدہ خود کو دیا کہ رویت ہلال ہمیشہ سے جھگڑے کی چیز چلی آئی ہے۔ تیرھویں اور چودھویں میں چنداں فرق نہیں۔ لیکن پہلے تو اس کا گھونسلہ نہ ملا۔ ملا تو اس میں بیٹ نہ تھی۔

تہی دستانِ قسمت راچہ سود از رہبر کامل

یہ مل جاتی تو اس کے بعد فقط نوگزے پیر کے مزار پر چالیس دن کا مراقبہ کرنے کی شرط رہ جاتی تھی جس کے بعد ان سب چیزوں کو کالی ہنڈیا میں گل حکمت کر کے سرمہ بنا کر اس کی ایک ایک سلائی رجب کی ۲۸ ویں کو بوقت طلوع آفتاب اپنی دونوں آنکھوں میں لگانی تھی۔ اور اگر اس عمل کے بعد ہماری بینائی باقی رہ جاتی تو ہمیں ساری دُنیا کا سونا نظر آ جاتا۔ اپنا سونا تو خیر سمیٹ لیا جاتا۔ باہر کے سونے کو شاید اسمگل کر کے لانا پڑتا۔ خیر اس کی نوبت ہی نہ آئی۔

اس میں شک نہیں کہ دولت مند بننے کے بعض آسان تر نسخے بھی ہمارے ہاں مروج ہیں مثلاً ہنڈیا میں نوٹ ڈال کر ان کو دُگنے کرنا لیکن اس میں ایک قباحت یہ ہے کہ جب تک ہنڈیا میں کچھ ڈالا نہ جائے دُگنا نہیں ہو سکتا۔ ایک باکمال بزرگ ہمیں بھی ملے۔ ہم نے کہا۔

بندہ پرور! ہمارے پاس نقد تو کچھ ہے نہیں آپ سو روپے ہماری طرف سے ہنڈیا میں خود ہی ڈال دیجئے۔ یہ آپ کا ہم پر قرض متصور ہو گا۔ دُگنے ہو جائیں تو ان میں سے اپنی رقم وضع کر لیجئے گا بلکہ دس پانچ اُوپر سے لیجئے گا۔ باقی پر ہم اکتفا کریں گے۔ کیونکہ لالچ ہماری طبیعت میں نہیں ہے۔ لیکن وہ نہ مانے۔

کچھ دن بعد ہمارے پاس ایک اچھی خاصی رقم آئی۔ دس روپے سے اُوپر ہی اُوپر تھی۔ اب ان بزرگ کو تلاش کیا تو اتفاق سے ان کے پاس ہنڈیا نہ تھی۔ کیونکہ جیل میں اس کے رکھنے کی اجازت نہیں۔ یہ بھی ہمیں معلوم ہوا کہ پولیس آس پاس ہو تو روپے دُگنے نہیں ہوتے۔ عمل کی تاثیر جاتی رہتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

انہی دنوں ایک صاحب نے یہ نسخہ بتایا کہ سیدھے کسی رئیس کی فرزندی میں چلے جاؤ اور عمر بھر چین کی بنسی بجاؤ۔ اس میں پہلی قباحت تو یہی تھی کہ بنسی خواہ چین ہی کی ہو، عمر بھر بجانا مشکل ہے۔ دوسرے جب کوئی رئیس ملا تو فرزندی کا ذکر درمیان میں نہ لایا اور اگر کوئی یہ ذکر درمیان میں لایا تو پتہ چلا کہ وہ رئیس نہیں۔ ان مرحلوں سے گزرنے کے بعد ہی ہم نے ڈیل کارنیگی کی کتابوں سے رجوع کیا۔ اور گھر بیٹھے دولت مند بننے کے تجربے کئے اور دفتر کی میز پر بیٹھ کر معمے حل کرنے میں کمال حاصل کیا لیکن یہ داستان طویل ہے۔ پھر کسی موقع پر بیان ہو گی۔

صدارت

"جی فرمایئے"

"حضور میں ہوں گجراتی ادبی منڈل کا سیکرٹری نار محمد دکھیا۔ ہم گجراتی کے مشہور ادیب حضرت غبغب گھڑیالوی کی برسی منا رہے ہیں۔ آپ صدارت فرمایئے گا۔"

"دکھیا صاحب۔ ہم انکار کر کے آپ کو مزید دکھیا تو بنانا نہیں چاہتے۔ لیکن گجراتی ہم نہیں جانتے اور غبغب صاحب کا نام بھی آج ہی سنا ہے۔"

"جی یہ کوئی بات نہیں ہے۔ آج کل بہترین صدارت وہی لوگ کرتے ہیں۔ جو موضوع یا ممدوح کے متعلق کچھ نہ جانتے ہوں۔"

"عجیب بات ہے۔ مثالیں دے کے واضح کیجیے نار محمد صاحب"

"آپ نے سنا ہو گا۔ پچھلے دنوں بروہی صاحب نے اقبال کی شاعری پر ایک نہایت پرمغز تقریر کی بعد ازاں فرمایا صاحبو۔ میں نہ اردو جانتا ہوں نہ فارسی"

لیکن ہر کوئی بروہی صاحب تو نہیں ہو سکتا کہ جس چیز کے متعلق کچھ نہ جانتا ہو اس پر نہایت جامع مانع اور مدلل تقریر کرے۔

"لیکن جی بیگم وقارالنساء نون نے تو یوم اقبال اور نذرالاسلام کے مجموعی جلسے کی صدارت کر ڈالی اور بڑی دلپذیر تقریر کی"۔

"بھئی ہم انہیں جانتے نہیں۔ کیا پتہ وہ اردو فارسی اور بنگلہ وغیرہ کی فاضل ہوں"

"جی انہوں نے وضاحت کر دی کہ مجھے یہ زبانیں نہیں آتیں اور میں نے ان شاعروں کو پڑھا بھی نہیں لیکن اتنا معلوم ہوا ہے کہ عمل کی تلقین کیا کرتے تھے۔ پس اے حاضرین جلسہ تم بھی عمل کیا کرو۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے مت بیٹھے رہا کرو بس مجھے اتنا ہی کہنا تھا۔ السلام وعلیکم"۔

"بھئی ہماری مصروفیات ہیں۔ ہمیں معاف کرو"

"آپ ناحق گھبراتے ہیں انشا صاحب۔ گھبرائیے نہیں یوں تو آپ کو معلوم ہے ایسے موقع پر کیا کہا جاتا ہے۔ کہیں آپ رکیں تو یہ بندہ لقمہ دینے کو تیار ہے یا تو میں آپ کے کان میں بتا دیا کروں گا۔ آپ پانی پینے کے بہانے سن لیں یا پرچی لکھ کر بڑھا دیا کروں گا"۔

ہم نے کہا اچھا بھئی۔ آپ مجبور کرتے ہیں تو منظور، ورنہ ہمارا اب بھی یہی خیال تھا کہ ....

جناب تار محمد دکھیا نے ہمارے گلے میں گوٹے کا چمکیلا ہار ڈالا جو غالباً اس سے پہلے کئی صدروں کے گلے کا ہار ہو چکا تھا اور اس کے علاوہ مختلف منگنیوں اور شادیوں وغیرہ کے موقع پر بھی استعمال ہو چکا تھا۔ بعد ازاں ہمارا اور ہمارے علم و فضل کی بیکرانی کا ذکر کیا اور کہا کہ ہر چند انشا صاحب گجراتی زبان نہیں جانتے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ غبغب صاحب کا کسی اور زبان میں ترجمہ نہیں ہوا تاہم

وہ غبغب مرحوم کے افکار اور شاعری پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں۔ انہوں نے باوجود بے پناہ مصروفیتوں کے تشریف لاکر ہماری عزت افزائی کی ہے۔ اب میں انشا صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ خطبہ ارشاد فرمائیں۔

ہم نے پانی مانگا۔ سیکرٹری صاحب نے ایک گلاس آگے بڑھایا۔ ہم نے کہا پورا جگ چاہیئے۔ وہ بھی آگیا۔ ہم نے سیکرٹری صاحب کو ان کا فرض یاد دلایا اور پانی پی کر یوں رطب اللسان ہوئے۔

"صاحبو۔ حضرت غبغب گھڑیالوی کو کون ہے جو نہیں جانتا۔ پاکستان کے لئے ان کی خدمات فراموش نہیں کی جاسکتیں (سیکرٹری نے پرچی دی :۔ ان کا انتقال تو ۱۹۱۴ء میں ہوگیا تھا) حالانکہ وہ پاکستان بننے یا پاکستان کا نظریہ پیش ہونے سے بہت پہلے ۱۹۱۴ء کی لڑائی میں داد شجاعت دیتے ہوئے کام آگئے تھے۔ (سرگوشی :۔ ان کا انتقال ملیریا سے ہوا تھا، لڑائی میں نہیں) ہمارا مطلب ہے کہ ۱۹۱۴ء کی جنگ کے دنوں میں ایک جان لیوا بیماری سے نبرد آزما ہوتے ہوئے جان جاں آفریں کو سپرد کی ہے

نشان مرد مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

ہم جب ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں (پرچی :۔ شاعر نہیں ناول نگار تھے) جس کو غالب کی طرح وہ ذریعہ عزت نہیں سمجھتے تھے اور ان کے ناولوں کی طویل فہرست پر نظر ڈالتے ہیں (پرچی :۔ انہوں نے صرف ایک ناول لکھا تھا جو ہے دا ان)

جن میں سے صرف ایک چھپا باقی کتم عدم سے ظہور میں نہ آئے یا آئے تو چوہوں نے کھالئے۔ توان کی عظمت ہمارے دل پر نقش ہو جاتی ہے۔ ان نے کمال فن کا اندازہ کرنا ہو تو ایک نظر ان کے ناول چوہے دان پر ڈالنی کافی ہے۔

(پرچی :- "چوہے دان نہیں چمنستان")

واقعی پرچی پر چمنستان ہی لکھا تھا ہم جانے کیوں چوہے دان پڑھ گئے تھے بہرحال اب ہم نے بانی پی پی کر ان کے حالات زندگی کی طرف سے گریز کیا۔

"گھڑیالہ جس کی نسبت سے وہ گھڑیالوی کہلاتے ایک مردم خیز قصبہ ہے (پھر پرچی آئی :- گھڑیالہ کوئی قصبہ نہیں، غبغب صاحب کے بزرگ شاہی دربار میں گھڑیال بجایا کرتے تھے) یہ بات ایک مشہور نقاد نے ایک مضمون میں لکھی ہے سے پڑھ کر ہمیں بڑی ہنسی آئی کیونکہ گھڑیالہ نام کا کوئی قصبہ گجرات میں نہیں، صل میں غبغب صاحب کے بزرگ شاہی دربار میں گھڑیال بجایا کرتے تھے۔ ادبی تاریخیں لکھنے والے ذرا بھی تحقیق نہیں کرتے۔ جو انٹ سنٹ چاہتے ہیں۔ ھ دیتے ہیں اردو کے مشہور شاعر حضرت شیوا چوہڑکانوی کے بارے میں بھی اکٹر دغمزدہ رودولوی نے لکھ دیا تھا کہ وہ چوہے پکڑا کرتے تھے۔ حالانکہ چوہڑکانہ یک قصبہ ہے۔ جہاں کا اچار مشہور ہے۔ شیوا صاحب بڑے شیوا بیان شاعر تھے۔ میں آپ کو چند اشعار سناتا ہوں جو صفت مراعات النظیر میں۔ سہ میں زبان باد خدایا یہ کس کا نام آیا۔ یہ نظیر اکبرآبادی بھی خوب شاعر تھے (پرچی : یہ یوم غبغب صاحب کا ہے نظیر اکبرآبادی کا نہیں) لیکن افسوس یہ یوم نظیر اکبرآبادی

کا نہیں ورنہ ہم ان کی نظم بنجارہ نامہ کے چند بند آپ کو سناتے، بلکہ بیڈ ھب انبالوی کا ہے (سرگوشی:- صحیح نام غبغب گھڑیالوی ہے) جن کا صحیح نام غبغب گھڑیالوی تھا۔ پس ہم اس دعا کے ساتھ اپنی تقریر کو مختصر کرتے ہیں کہ خدا نئی پود کے ادیبوں کو ان کی شاعری یا ناول نگاری جو کچھ بھی وہ کرتے تھے۔ اس کی تقلید کی توفیق دے تاکہ وہ بھی اسی طرح آنکھیں کھول کر مظاہر قدرت کا مشاہدہ کریں۔ جس طرح غبغب صاحب کرتے تھے اقبال صاحب بھی کہہ گئے۔

کھول آنکھ فلک دیکھ زمین دیکھ فضا دیکھ

سیکرٹری صاحب نے پرچی دی "غبغب صاحب تو نابینا تھے" لیکن یہ بعد از وقت آئی تھی اس لئے اسے ہم نے ایک طرف ڈال دیا اور پانی کا ایک گلاس پی کر تالیوں کی گونج میں بیٹھ گئے۔

آپ نے دیکھا ہو گا کہ آج کل اقبال کا صحیح مقام بھی انگریزی زبان ہی میں متعین کیا جاتا ہے اور اس کے لئے کسی نہ کسی غیر ملکی کو بلایا جاتا ہے۔ اب کے ایک یوم اقبال تو ایرانی کلچرل سینٹر میں منایا گیا۔ ایک ہم نے اپنے چلدوست احباب کے ساتھ مل کر اپنے کلب میں منایا۔ ہمیں صدارت کے لئے کسی غیر ملکی کی تلاش تھی۔ خوش قسمتی سے کسی نے ہمیں ہالینڈ کے ایک نکتہ داں مسٹر ہیگ روٹرڈم سے ملا دیا اور وہ صدارت پر راضی بھی ہو گئے۔ ہم نے کہا۔ آپ کو کچھ اقبال کے متعلق بتا دیں! بولے "واہ اس مایہ ناز ہستی کو کون نہیں جانتا اس نے فلسفہ خودی ایجاد کیا تھا نہ۔ بس یہ بتا دیجئے کہ رہنے والے کہاں کے تھے۔" ہم نے کہا "سیالکوٹ کے جہاں کھیلوں کا سامان بنتا ہے۔" فرمایا "مر گئے

یا ابھی مرنا ہے" ہم نے کہا" آپ کی اور ہماری خوش قسمتی سے مر گئے ہیں"۔

"بولتے" کیوں مر گئے"

ہم نے کہا" ہم خود بھی حیران ہیں کہ ملّت کو ابتلا میں چھوڑ کر کیوں مرے"۔

فرمایا" میرا مطلب ہے۔ کیسے مرے"

"بس حکیموں ڈاکٹروں کی دوائیں کھا کر مرے لیکن آپ کو اس سے کیا مطلب؟ آپ ان کی شاعری اور شخصیت پر بولیئے"۔

" اچھا۔ نام ذرا پھر سے بتا دیجئے۔ ایکو بلال تھا شاید" ہم نے

ہم نے کہا ایکو بلال نہیں بابا۔ اقبال۔ ٹھیک سے یاد کر لو"۔

مسٹر ہیگ روٹرڈم نے اپنی پُر مغز تقریر کا آغاز ہی سیالکوٹ سے کیا۔ اس کی وجہ شہرت بیان کی اور فرمایا۔ اقبال بھی کھیل ہی کھیل میں بہت سی کام کی باتیں کہہ گئے ہیں۔ آج کل تو فلسفہ خودی کی بہتات ہے۔ بلکہ اسے وساور بھیج کر زرمبادلہ بھی کمایا جا سکتا ہے لیکن ایجاد یہ اس شاعر نامی گرامی کی تھی۔ یہ فارسی اور اُردو میں لکھتے تھے اور خوب لکھتے تھے۔ اے کاش ڈچ زبان کی شیرینی پر ان کی نظر گئی ہوتی وہ اس میں لکھتے اور ہم ان کا مطالعہ کر سکتے۔ اب ہم سب کو چاہیئے کہ ان کے نقش قدم پر چلیں اور ان کا اُجالا زمانے میں پھیلائیں۔ جس طرح فلپس کمپنی کے بلب پھیلاتے ہیں۔ جس کی پاکستان میں نمائندگی کا شرف اس ناچیز کو حاصل ہے یہ کمپنی صرف بلب ہی نہیں، ریڈیو، ٹرانزسٹر، ٹیلیویژن، ٹیوب لائٹ ہر طرح کا مال عمدہ بناتی ہے اور بکفایت فراہم کرتی ہے (ہم نے انہیں ٹہوکا دیا کہ موضوع پر آئیں) اور ہاں

ایکو بلال (ہم نے ایک اور ٹھو کا دیا) یعنی اقبال صاحب بہت بڑے اور مایہ ناز شاعر تھے سمجھ میں نہیں آتا کیوں مر گئے اور قوم کی نیا بھنور میں چھوڑ گئے (تالیاں) سُنا ہے ڈاکٹروں اور حکیموں کی دوائیں کھا کھا مر گئے۔ ابھی طبی سائنس کو اور ترقی کرنی ہے۔ فلپس کمپنی نے اس پر بھی ریسرچ کا شعبہ کھولا ہے۔ ہماری تحقیقات کامیاب ہو گئیں تو آیندہ اچھے اچھے شاعر مرا نہیں کریں گے بلکہ صدیوں ایڑیاں رگڑا کریں گے۔ ان کی جان نہیں نکلا کرے گی (تالیاں) میں شکریہ ادا کرتا ہوں (ہمارا نام بھول کر) اپنے ان محترم دوست کا جنہوں نے مجھ ہیچمدان کو اس عزت سے نوازا اور کرسی صدارت پر بٹھایا بے شک اقبالؔ سے مجھے بہت دلچسپی ہے اور میں اور بھی تقریر کرتا لیکن افسوس ہال میں روشنی بہت کم ہے۔ اگر آپ لوگ فلپس کی ٹیوب لائٹیں استعمال کرتے ۔۔۔۔۔۔۔۔

ان کی تقریر کا آخری حصہ تالیوں کے شور میں ڈوب گیا۔ ٹھیک سے سُنا نہ جا سکا۔